تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

تحولِ زبان کے تناظر میں سید کاشف رضا کے ناول چار درویش اور ایک کچھوا کا سماجی لسانیاتی مطالعہ

محقق:

سائرہ ممتاز

238-FLL/MSURDU/F19

نگران:

ڈاکٹر بی بی امینہ

لیکچرر، شعبہ اُردو (خواتین)

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No TH-5583

MS
891.4393
س ا ت

اردو ادب ۔ ناول

تحول زبان

ناول ۔ سماجی لسانیاتی مطالعہ

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ سائرہ ممتاز رجسٹریشن نمبر 238-FLL/MSURDU/F19 نے ایم۔ ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"تحولِ زبان کے تناظر میں سید کاشف رضا کے ناول چار درویش اور ایک کچھوا کا سماجی لسانیاتی مطالعہ"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

Ameena

نگران: ڈاکٹر بی بی امینہ

لیکچرر، شعبۂ اُردو (خواتین)

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **SAIRA MUMTAZ**

Title of the Thesis: **تحولِ زبان کے تناظر میں سید کاشف رضا کے ناول چار درویش اور ایک کچھوا کا سماجی لسانیاتی مطالعہ**

Registration No: **238-FLL/MSURD/F19**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr. Fehmida Tabassum
Associate Professor
HOD, Federal Urdu University
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Bibi Ameena
Lecturer
Department of Urdu, IIUI
Islamabad

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

انسانی زندگی اور کائنات کی ہر چیز ہر لحظہ ارتقا کے عمل سے گزر رہی ہے۔ اس تغیراتی تبدیلی کے پیش نظر انسان بھی نئی منزلوں کی جانب گامزن ہوتا ہے۔ راقمہ بھی اپنی زندگی میں جب حصولِ علم کی اس نئی منزل کی جانب رواں ہوئی تو کورس ورک کے بعد تحقیق کا مشکل ترین مرحلہ سامنے آیا۔ تحقیق کے سفر میں ابتدائی مرحلہ موضوع کے انتخاب کا تھا۔ چوں کہ راقمہ جامعہ میں اردو لسانیات کے اولین طلبا میں سے تھی اس لیے ایسے منفرد موضوع کی تلاش تھی جو تحقیقی سطح پر جدت کے ساتھ نئے موضوعات سامنے لانے کا باعث بنے۔ اس سلسلے میں راقمہ کی نگرانِ مقالہ ڈاکٹر بی بی امینہ نے مدد اور راہ نمائی فرمائی۔ اور یوں تحولِ زبان (Code Switching) پر مبنی اس موضوع کا انتخاب ہوا۔ اس موضوع پر اس سے قبل جتنا بھی تحقیقی کام ملتا ہے سب انگریزی لسانیات میں ملتا ہے لہٰذا اس کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر یہ موضوع منتخب کیا گیا۔

تحولِ زبان کے اطلاقی ڈھانچے کے اطلاق کے لیے عصرِ حاضر کے ممتاز ناول نگار، صحافی اور مترجم سید کاشف رضا صاحب کے ناول چار درویش اور ایک کچھوا کا انتخاب کیا گیا۔ سید کاشف رضا نے اپنے اس اولین ناول میں اسلوب اور ہیئت کے علاوہ زبان کے بہترین جوہر دکھائے ہیں۔ مذکورہ ناول میں اردو، عربی، انگریزی، پنجابی اور پوٹھوہاری زبانوں کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل پر راقمہ سب سے پہلے اللہ رب العزت کی شکر گزار ہے جس کے کرم سے اس کام میں راقمہ کو سرخروئی حاصل ہوئی۔ اس پاک ہستی کے شکر کے بعد جن لوگوں کی راقمہ تاحیات شکر گزار رہے گی ان میں راقمہ کے والدین خاص کر والد محترم، اساتذہ، سسرال، شریکِ حیات اور ڈیڑھ سالہ بیٹی مبرا اویس شامل ہیں۔ ان سب کی نیک دعاؤں اور تعاون کے لیے راقمہ تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے۔ مقالہ ہذا راقمہ کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر بی بی امینہ کی زیرِ نگرانی پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ان کی راہ نمائی اور مشفقانہ رویے کی بدولت تحقیق کا مرحلہ آسان ہوا۔ مقالے کے مجوزہ خاکے سے لے کر آخری حرف لکھنے تک انھوں نے راہ نمائی فرمائی۔ راقمہ کو تحقیق کے اس سفر میں صحیح معنوں میں راہ نما استاد میسر رہا ہے کہ وہ تحقیقی معیار کے اصولوں کے مطابق مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

مقالے کی تکمیل کے دوران ناول چار درویش اور ایک کچھوا کے مصنف جناب کاشف رضا صاحب کا تعاون اور راہ نمائی بھی مقالہ نگار کو حاصل رہی۔ جب بھی ناول کی تحریر سمجھنے میں مشکل در پیش آئی انھوں نے فوراً اس کا سدِباب بھی پیش کیا۔ مقالہ نگار مصنف کی خاص کر ممنون ہے کہ انھوں نے ناول سے متعلق اہم معلومات فراہم کیں اور راقمہ کا حوصلہ بڑھایا۔

مقالے کے دوران راقمہ کو جو مشکلات پیش آئیں ان میں سب سے بڑی وجہ انگریزی مواد کے ترجمے کی تھی۔ چوں کہ تمام تر مواد انگریزی لسانیات میں میسر تھا اور انگریزی کتب اور مقالوں کا ترجمہ خاص کر انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ ایک انتہائی دشوار گزار عمل تھا۔ اس سلسلے میں جہاں راقمہ کو اپنی نگران استاد کی مدد حاصل تھی وہیں اپنی ساتھی طالبات سدرہ طارق اور راحیلہ لطیف کا ساتھ میسر رہا، جنھوں نے نہ صرف مواد کی فراہمی اور اصطلاحات کے تراجم ڈھونڈنے میں بھرپور تعاون کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ راقمہ کا حوصلہ بھی بڑھایا۔ راقمہ رابعہ مصطفیٰ اور آسیہ کمال جنھوں نے پنجابی اور انگریزی تراجم میں مدد فرمائی ان کی بھی شکر گزار ہے۔ راقمہ اپنی دوست یُسریٰ طاہر کی بھی شکر گزار ہے، جو تکنیکی مسائل کے حل کے علاوہ ہر وقت راقمہ کی مدد کرنے اور حوصلہ بڑھانے میں پیش پیش رہی۔ محترمہ عاصمہ نذیر کا بھی شکریہ، جنھوں نے مقالے کی نوک پلک سنوارنے میں تعاون کیا۔

اس کے علاوہ بھی مقالے کی تحریر میں جن افراد کا تعاون اور نیک تمنائیں ساتھ رہیں ان سب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

سائرہ ممتاز

جون ۲۰۲۲ء

فہرست موضوعات

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
	پیش لفظ	
	باب اوّل:	
۱	تحولِ زبان: تعارف و تفہیم	
۲۶	حوالہ جات و حواشی	
	باب دوم:	
۳۱	چار درویش اور ایک کچھوا: ایک تعارفی مطالعہ	
۴۹	حوالہ جات و حواشی	
	باب سوم:	
۵۴	چار درویش اور ایک کچھوا میں تحولِ زبان کی نوعیت و مظاہر	
۷۴	حوالہ جات و حواشی	
	باب چہارم:	
۸۰	چار درویش اور ایک کچھوا میں تحولِ زبان کے قواعدی اور نفسیاتی لسانیاتی پہلو	
۱۰۰	حوالہ جات و حواشی	
۱۰۵	ماحصل	
۱۰۸	کتابیات	

بابِ اوّل:

تحوّلِ زبان: تعارف و تفہیم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(Joshua Fishman:1926-2015) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] 2003)

(William Downes: 1976- [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گذشتہ ساٹھ سال کی مسافت میں سماجی لسانیات ایک وسیع علم بن چکا ہے۔ مغرب میں اس موضوع پر بہت کام کیا گیا مگر اردو میں اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، لیکن اب اس کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے ماہرینِ لسانیات اس طرف متوجہ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ سماجی لسانیات کے مطالعے کو رچرڈ ہڈسن (Richard Hudson: 1939) دو حوالوں سے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ سماجی زندگی کا لسانیاتی مطالعہ یعنی لسانی سماجیات (Linguistic Sociology)

۲۔ سماج میں زبان کے استعمال کا مطالعہ یعنی سماجی لسانیات (Sociolinguistics)

لسانی سماجیات میں جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سماجی ساخت کو کیسے زبان کے مطالعے سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے جب کہ سماجی لسانیات میں سماج کے تعلق سے زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ سماجی لسانیات کے مباحث میں بولیاں (Dialects) ، زبانیں (Languages) ، لہجے (Accents) ، جنس (Genders)، یک لسانی گروہ (Monolinguals)، کثیر لسانی گروہ (Multilinguals) ، مستعاریت (Borrowing) ، تحولِ زبان (Code Switching) اور ادغامِ زبان (Code Mixing) شامل ہیں۔[۹]

چوں کہ زیرِ نظر تحقیقی مقالے کا موضوع تحولِ زبان ہے لہٰذا اگلی سطور سے تحولِ زبان کے مباحث کا جائزہ لیا جائے گا۔

تحولِ زبان:

تحولِ زبان (Code Switching) سماجی لسانیات کے مباحث میں سے ایک ہے۔ سماجی لسانیات میں جب زبان میں ردوبدل وجود میں آتا ہے یعنی کوئی متکلم کسی گفتگو میں ایک سے زائد زبانوں کا استعمال کرتا ہے تو یہ کیفیت تحولِ زبان کہلاتی ہے۔ ذولسانی یا کثیر لسانی گروہ اپنی گفتگو کو بامعنی اور پُراثر بنانے کے لیے کچھ حکمت عملیوں کا استعمال کرتے ہیں جن میں سے ایک تحولِ زبان یا تبدیلیٔ زبان ہے جو ہمارے مشاہدے میں عام ہے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یک لسانی، ذولسانی اور کثیر لسانی گروہوں کا مختصر سا جائزہ لے لیں۔

کسی ایک زبان میں گفتگو کی صلاحیت یک لسانیت کہلاتی ہے۔ یک لسانیت کسی خاص خطے کی نمائندگی کرتی ہے اس حقیقت کے باوجود زیادہ تر ماہرینِ لسانیات اپنے نظریات میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ یک لسانی گروہوں کے حامل افراد کے بارے میں عموماً یہ رائے پیش کی جاتی ہے کہ وہ معاشرے میں صحیح طرح سے ڈھل نہیں سکتے۔ فرینکوئس گروسجین (Francois Grosjean: 1946) کے مطابق قریباً دنیا کی ۶۰ فی صد سے زائد آبادی یک لسانی ہے۔ اسی طرح ذولسانیت کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "دنیا کی قریباً نصف آبادی ذولسانی ہے اور قریباً ہر

ملک میں ذولسانیت پائی جاتی ہے۔"[7]

ذولسانیت متکلم کی دو زبانوں میں بات کرنے کی صلاحیت کا نام ہے جب کہ کثیر لسانیت دو سے زائد زبانوں میں کلام کی صلاحیت ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں لوگ کئی زبانوں کو جانتے اور بولتے ہیں۔ دوسری طرف کئی ممالک میں لوگ انھی زبانوں سے ناآشنا ہوتے ہیں یعنی ذولسانی اور کثیر لسانی ہونا معمول کی بات ہے۔ ماہرین زبان جانتے ہیں کہ کثیر لسانیت کوئی مسخ یا اقلیتی رجحان نہیں ہے جیسا کہ متعدد اہلِ انگریزی سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ دنیا کی اکثریتی آبادی کی معمولی اور قابلِ تقاضا ضرورت ہے گو کہ ان کی تعداد اور تقسیم سے متعلق کوئی درست اعداد و شمار موجود نہیں ہے۔ دنیا میں موجود زبانوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر رؤف پاریکھ زبانوں کی تعداد چھے ہزار سے آٹھ ہزار کے درمیان بتاتے ہیں۔[8] جب کہ قومی ریاستوں کی تعداد ۲۰۰ ہے یعنی قریباً ہر ملک میں ۲۵ گنا زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ نوم چومسکی (Noam Chomsky:1928) لسانیات کے مطالعے سے متعلق کہتے ہیں کہ "لسانی نظریہ مثالی سامع اور مقرر سے متعلق ہے جو کہ یک لسانی گروہ میں اپنی زبان سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں۔"[9]

اس کے برعکس کثیر لسانی معاشروں میں لوگ شاذو نادر ہی کسی زبان پر عبور رکھتے ہیں۔ در حقیقت ایسا معاشرہ جس نے ایسے افراد پیدا کیے جو اپنے افعال کے لیے دو یا زائد زبانوں کا استعمال نہیں کرتے جلد ہی کثیر لسانی کہلانا بند ہو جائیں گے۔

دونوں اصطلاحات ذولسانی اور کثیر لسانی ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ کثیر لسانیت تعلیمی سطحوں پر، خاندانوں اور معاشروں میں موجود ہے۔

ایک سے زائد زبان بولنے والے افراد اکثر احساسِ برتری میں مبتلا ہوتے ہیں اور اسی طرح کی ملی جلی کیفیت ان سے متعلق ہم بھی رکھتے ہیں کہ وہ کئی زبانوں کو روانی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ اس صلاحیت پر ان کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔ تعریف و حسد کا مرکب اور کبھی کبھی احساسِ برتری ان میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسے لوگ کسی علاقے کے مستقل باشندے نہ ہوں بلکہ تاجر، زائرین یا مخلوط شادیوں سے ہونے والے بچے ہوں۔[10]

تاہم دنیا کے بہت سے حصوں میں ایک سے زائد زبان بولنے کی صلاحیت رکھنے والے لوگ ہیں۔ ذولسانیت یا کثیر لسانیت کے حامل افراد کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ اور زبان جو وہ منتخب کرتے ہیں کیسے اثرات ڈالتی ہے؟ اس سے متعلق موضوعات میں سماجی زبان، مختلف قسم کے ذولسانی گروہ اور وہ مسائل جو ذولسانی گروہوں کو درپیش ہوتے ہیں نیز زبانوں کے اختلاط اور تحولِ زبان شامل ہیں۔

جب کوئی شخص دو یا زائد زبانوں میں روانی رکھتا ہے تو اسے اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ کسی گروہ میں کب کس زبان کا انتخاب کرے یعنی ایسی صورت حال جس میں متکلم اختیار رکھتا ہے کہ وہ کسی گفتگو میں کب ایک زبان میں دوسری زبان کا اختلاط کرے تحولِ زبان کہلاتا ہے۔

فرگوسن (Charles Ferguson:1921-1998) معاشرتی ذولسانی صورت حال کو تحولِ زبان کا نام دیتے ہیں۔[11]

> تحولِ زبان در حقیقت معاشرے میں استعمال ہونے والی دو زبانوں کا باہم تاریخی ربط ہے۔ دونوں کی جڑیں آپس میں مدغم ہوتی ہیں۔ فرگوسن نے زبان کو اعلیٰ وقار کا حامل قرار دیا ہے جو رسمی سیاق وسباق اور تحریر میں معیاری اور مقامی سطح کی استعمال ہوتی ہے۔[12]

اس کے بعد تحولِ زبان کا اطلاق بڑی سطح پر بھی کیا جانے لگا۔ تحولِ زبان ذولسانی گروہوں کے اختیار میں ویسے ہی ہے جیسے اسلوب، لہجہ، بولی اور انداز یک لسانی گروہوں میں۔

تحولِ زبان ذولسانی معاشروں کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس سے تقریر یا تحریر کے ذریعے ہم آہنگی قائم ہوتی ہے اور غیر رسمی گفت گو ہوتی ہے۔ لسانیات میں اس بارے میں کافی مباحث پائے جاتے ہیں کہ آیا تحولِ زبان کسی گفت گو میں فریقین کے مابین خاص نقطۂ نظر سے استعمال ہوتی ہے یا کچھ باقاعدہ رکاوٹیں ہیں جو مختلف حلقوں کے مابین تحولِ زبان کو ممکن یا ناممکن بناتی ہیں۔ ذولسانیت اور تحولِ زبان اگرچہ زبان کو نقصان پہنچانے والے عوامل کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ کچھ معاملات میں یہ اصطلاحات ذولسانیت کو برقرار رکھنے میں مثبت ثوتیں ہیں۔ جب کہ کچھ زبانیں تحولِ زبان کے تحت آپس میں مدغم ہو کر دوسرے کی ناپیدی کا سبب بنتی ہیں۔ جیسے مشرقی بربر زبانیں جو لیبیا اور مصر میں بولی جاتی تھی، قریباً ناپید ہو گئی ہیں اور اور ان کی جگہ عربی رائج ہو گئی ہے۔[13]

اس طرح لاطینی زبان کا اثر اب جدید زبانوں (انگریزی اور جرمنی) میں ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ عام طور پر بولی نہیں جاتی۔ لاطینی اب مردہ زبان سمجھی جاتی ہے۔ یہ مخصوص سیاق و سباق میں استعمال ہو جاتی ہے لیکن کوئی مقامی لاطینی بولنے والا نہیں ہے۔[14]

سنسکرت زبان جو ہندوستان کی قدیم ترین زبان ہے، اپنی سختیوں کے باعث اب اپنا وجود کھو چکی ہے۔[15]

متکلم پر منحصر ہے کہ وہ ایک گفت گو میں کلام کو موثر بنانے کے لیے کس زبان کا انتخاب کرے۔ یہ تحولِ زبان کی کیفیت ہے جو جملوں کے مابین مختصر جملوں حتیٰ کہ الفاظ میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

پینی لوپ گارڈنر کلوروز (Penelope Gardner Chloros: 1954) کے مطابق تحولِ زبان کو دیکھتے وقت پہلا اور اہم پہلو سماجی لسانیات ہونا چاہیے جو متکلم کے نقطۂ نظر سے ہو۔ جہاں متکلم کی زبان کا استعمال، متکلم کی سماجی

شناخت، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہو۔ مختلف باشندوں کے مابین باہم شناخت پیدا کرنے کے لیے تحولِ زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔[۱۶] مثال کے طور پر اگر کسی شخص کی مادری زبان اردو ہے اور اس کا واسطہ ایسے شخص سے پڑتا ہے جو پنجابی زبان بولتا ہے مگر اردو بھی جانتا ہے تو ایسے افراد کی گفتگو تحولِ زبان سے بھرپور ہوگی گو کہ ان دونوں کو اپنی بات سمجھانے کے لیے تحولِ زبان کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ دونوں کسی ایک زبان میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ لہٰذا تحولِ زبان کا استعمال بوقت ضرورت ہی نہیں بلکہ متکلم اپنی شناخت کو مستحکم بنانے کے لیے بھی کرتا ہے۔ مریم مئیر ہوف (Mirriam Mayorhoff:1964) کا تحولِ زبان سے متعلق کہنا ہے:

> لوگ جو ایک سے زائد زبانیں بولتے ہیں اور ان پر عبور رکھتے ہیں، وہ ان زبانوں میں جو وہ بولتے ہیں فرق کرنے سے متعلق حساس ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کون سی زبان کس سیاق میں کسی دوسری زبان کے استعمال سے بہتر ہے۔ یہ بات انھیں زبان کی تبدیلی میں راہ نمائی فراہم کرتی ہے جس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس ماحول میں ہیں۔ زبان کی تبدیلی کا یہ نمایاں رجحان تحولِ زبان کہلاتا ہے۔[۱۷]

تحولِ زبان کسی جماعت میں گفتگو کی حدود کو قائم کرنے، عبور کرنے یا ختم کرنے کے لیے استعمال ہونے والی حکمت عملی ہے۔ رونالڈ ورڈا (Ronald Wardhaugh:1932) سنگاپور کی مثال یوں دیتے ہیں کہ ان کے عوام چار زبانوں یعنی انگریزی (English)، مینڈارن (Mandarin)، تامل (Tamil) اور ملائی (Malay) پر مکمل عبور رکھتے ہیں اور ان چاروں زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ تاہم علاقائی باشندے ہاکین (Hokkien) زبان کا استعمال کرتے ہیں جو چینی (Chinese) زبان ہی کی ایک قسم ہے۔ ملائی کو معاشرتی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ عوامی سطح پر معاملات کی دیکھ بھال کے لیے انگریزی جب کہ بین الاقوامی زبان مینڈارن ہے۔ تامل مذہبی فرقوں کی زبان ہے یعنی کہ سنگاپور میں پرورش پانے والا ایک چینی بچہ والدین کے ساتھ ہاکین بولے گا۔ تعلیمی سطح پر انگریزی اور مینڈارن بولی جائے گی، مذہبی سطح پر مسیحیت کا پیروکار انگریزی بولے گا جب کی بدھ مت کا پیروکار ہاکین بولے گا۔ پورا خطہ ملائی زبان بھی بولتا ہے۔ البتہ سرکاری ملازمت کے لیے رسمی انگریزی اور مینڈارن مستعمل ہے۔ وہاں کے عوام زبان کے انتخاب میں خود مختار ہیں۔[۱۸]

نینسی ٹینر (Nancy Tanner:1933) کے مطابق انڈونیشیا کا طالب علم نو زبانوں پر عبور رکھتا ہے۔ تعلیمی سطح پر انگریزی بولی جاتی ہے جب کہ روزمرہ کی سرگرمیوں کے لیے انڈونیشیائی زبان بولی جاتی ہے۔ اسی طرح باقی سات زبانیں بھی ضرورت کے تحت بولی جاتی ہیں۔[۱۹] یہ صورت حال کینیا اور دیگر کئی ممالک میں بھی نظر آتی ہے۔

تحولِ زبان کی وجوہات:

بہت سی وجوہات کی بنا پر تحولِ زبان کا استعمال متکلم کرتا ہے جیسے مختلف سماجی میدانوں میں گفت گو کی بحالی کے لیے یا اجتناب کے لیے۔ تحولِ زبان ایک غیر جانب دار حکمت عملی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ کس صورت حال میں کون سی زبان مناسب اور قابلِ استعمال ہے۔ڈیوڈ کرسٹل(David Crystal:1941) نے تحولِ زبان کی جو وجوہات بتائی ہیں انھیں رؤف پاریکھ اپنی کتاب میں نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ متکلم ایک زبان میں بعض خیالات کے اظہار پر قدرت نہیں رکھتا لہٰذا کچھ باتیں بیان کرنے کے لیے دوسری زبان کے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

۲۔ گفتگو کی زبان تبدیل کر کے کسی ایسی زبان میں گفتگو کرنا جو مخصوص علاقے یا لسانی گروہ کی زبان ہو اس مخصوص علاقے یا لسانی گروہ سے ذہنی ہم آہنگی یا اتحاد و یکجہتی کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے۔

۳۔ متکلم کا زبان تبدیل کرنا مخاطب سے اس کے خاص رویے یا طرزِ عمل کا بھی عکاس ہو سکتا ہے مثلاً غصیلا، طنزیہ، مزاحیہ یا دوستانہ وغیرہ۔[۲۰]

تحولِ زبان کی اقسام:

امریکی ماہر لسانیات رومینی سوزین(Romaine Suzzane: 1984-2014) تحولِ زبان کی تین بڑی اقسام بتاتی ہیں۔

۱۔ دروں جملوی تحولِ زبان(Intra Sentential Code Switching)

۲۔ ٹیگ / اضافی تحولِ زبان (Tag/ Extra Sentential Code Switching)

۳۔ بین الجملوی تحولِ زبان(Inter Sentential Code Switching)

۱۔دروں جملوی تحولِ زبان:

دروں جملوی تحولِ زبان میں تحولِ زبان کا استعمال جملے کے وسط میں ہوتا ہے۔ متکلم بنا کسی ہچکچاہٹ یا مداخلت کے اسے استعمال کرتا ہے اور بعض اوقات وہ اس تبدیلی سے آگاہ بھی نہیں ہوتا۔ فقرے کے اندر یہ منتقلی لفظ کی سطح تک ہوتی ہے۔[۲۱]

اردو میں اس کی مثالیں یوں دی جا سکتی ہیں:

وہ اپنا کام مکمل کرنا چاہتی تھی **but** وہ بہ وجہ مجبوری نہ کر پائی۔

مجھے **شاور** لینا ہے۔

وہ **ڈیلی بیس** پر کام کرتی ہے۔

اس کی **منتھلی انکم** تیس ہزار روپے ہے۔

وہ **فائنینشلی** اتنے **اسٹرانگ** نہیں ہیں۔

اسی طرح though, whether اور کئی دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

انگرڈ فلک (س۔ن :Ingrid Falk) اپنے پی اے کے تھیسس میں دروں جملوی تحولِ زبان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس قسم میں ایک زبان کے مادے کے ساتھ دوسری زبان کے سابقے یا لاحقے کو لگایا جاسکتا ہے۔ انگریزی زبان کے لفظ Attach کے ساتھ سویڈش لاحقہ "a" لگانے سے attacha بن جاتا ہے۔ یعنی to attach something [۲۲] اردو میں اس کی مثال کے طور پر کشا، کدہ، لا، کش وغیرہ کے لاحقے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ ٹیگ تحولِ زبان:

دوسری قسم ٹیگ یا اضافی جملوی تحولِ زبان ہے جس میں جملے کے آغاز یا اختتام پر دوسری زبان کے مفرد لفظ یا ٹکڑے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ [۲۳]

اردو زبان سے اس کی مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

تم نے اسے مطلع کیا تھا، **Right؟**

Well! جیسا آپ کو بہتر لگے آپ کریں۔

Excuse me! کیا ہم دو منٹ بات کر سکتے ہیں؟

آپ کی کامیابی کا سن کر خوشی ہوئی، **Congrats**۔

آپ نے ہماری بہت مدد کی، **Thank you**۔

ان امثال میں اردو جملوں کے ساتھ انگریزی الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۳۔ بین الجملوی تحولِ زبان:

تیسری قسم بین الجملوی تحولِ زبان میں فقرے یا جملے کی حدود میں تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ جملے کے آغاز یا اختتام پر دوسری زبان کے الفاظ یا فقرے استعمال کر دیے جاتے ہیں۔ [۲۴] جیسے:

میں آپ کو مطلع کر دوں گی، **when they will come** ۔

Make them learm کہ کام کیسے کرنا ہے۔

You have to understand وہ کیسے وقت سے گزر رہے ہیں۔

کہتے ہیں نا کہ **ساری رات روندے رہے مریا کوئی نئیں۔**

وہ بیمار ہے You should visit her۔

گمپرز اور بلوم (John J. Gumperz:1922- 2013) (Alfred H.Blom:1946) کسی بھی گفت گو میں تحولِ زبان دو طرح کی بتاتے ہیں۔

۱۔ عبوری تحولِ زبان (Transitional Code switching)

۲۔ استعاراتی تحولِ زبان (Metaphorical Code switching)

گمپرز اور بلوم ناروے کے ایک گاؤں میں اسے یوں زیرِ بحث لاتے ہیں کہ دیہی ناروے کے باشندے خاندانی تقاریب اور معاشرتی تعلقات میں مقامی زبان اور لہجے کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تجارتی سطح پر معیاری ناروے زبان استعمال ہوتی ہے۔ یہ عبوری تحولِ زبان کے ذیل میں آتا ہے۔ البتہ استعاراتی تحولِ زبان مختلف مواصلاتی اثرات کا حامل ہے جس میں متکلم پیغام پہنچاتا ہے مثلاً استاد معیاری زبان میں لیکچر دیتا ہے لیکن جماعت میں طلبا کو مباحثے میں شامل کرتے ہوئے غیر رسمی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ صورت حال استعاراتی تحولِ زبان کو جنم دیتی ہے۔[۲۵]

گمپرز اور بلوم کے مطابق عبوری تحولِ زبان کو بعض ماہرین نے کیفیتی تحولِ زبان بھی کہا ہے یعنی **Situational Code Switching**۔ کیوں کہ اس میں حالات کے مطابق زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ متکلم پہلے ہی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ انھوں نے دورانِ گفتگو کس زبان کو ایک صورت حال میں اور کس زبان کو دوسری صورت حال میں استعمال کرنا ہے۔ موضوع کا بدلاؤ اس میں شامل نہیں ہے۔ لیکن موخر الذکر یعنی استعاراتی تحولِ زبان میں موضوع کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبان کی تبدیلی بھی شامل ہے یعنی متکلم موضوع کے مطابق ایک زبان سے دوسری زبان میں تبدل اختیار کرتا ہے۔ یوں گفتگو کے اجزا متکلم، مخاطب اور موضوع میں تبدیلی نہیں کی جاتی۔[۲۶]

ادغامِ زبان[۲۷] (Code Mixing):

تحولِ زبان ہی کے ساتھ ایک اصطلاح ادغامِ زبان (Code mixing) بھی استعمال ہوتی ہے۔ پینی لوپ گارڈنر اپنی کتاب میں لکھتی ہیں کہ بعض ماہرین انھیں ایک دوسرے کے مترادفات ہی قرار دیتے ہیں لیکن کچھ کا کہنا ہے کہ یہ تحولِ زبان کی ایک قسم یعنی دروں جملوی (Intra sentential) ہی ہے لیکن بعض ماہرین انھیں متضاد رجحانات بتاتے ہیں۔[۲۸]

ادغامِ زبان بچوں بوڑھوں سب کے ہاں میل جول میں نظر آتا ہے۔ یہ ایک ترقیاتی مرحلہ ہے جس کے دوران بچے ایک سے زیادہ عناصر کو آپس میں ملاتے ہیں۔ تقریباً تمام ذولسانی بچے ایک ایسے دور سے گزرتے ہیں جس میں وہ بغیر کسی امتیاز کے ایک زبان سے دوسری زبان میں تحول کرتے ہیں۔[۲۹]

ادغامِ زبان ایک متحرک عمل ہے جس میں مختلف شرکا شامل ہوتے ہیں۔ مخلوط زبانوں کا یہ استعمال یک جہتی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ کثیر لسانی گروہوں میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح مخلوط گفت گو کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ مریم میئر ہوف(Mirriam Meyerhoff:1964)کے مطابق "کسی انفرادی تبادلے میں یہاں تک کہ ایک ہی متکلم کی طرف سے گفتگو میں ادغام ہو سکتا ہے۔"[۳۰]

تحولِ زبان اور ادغامِ زبان کا فرق:

ادغامِ زبان اختلاط پر جب کہ تحولِ زبان ایک سے دوسری زبان میں نقل و حرکت پر زور دیتی ہے۔ دونوں اصطلاحات ذولسانی یا کثیر لسانی گروہوں میں ممکن ہیں جہاں متکلم ان کے استعمال کا اہل ہوتا ہے۔ تحولِ زبان کسی تقریر میں تسلسل فراہم کرتا ہے نہ کہ مداخلت پیدا کرتا ہے۔ تحولِ زبان اور ادغامِ زبان دونوں میں فقروں، جملوں اور الفاظ یا ایک جملے سے دوسرے جملے میں دو یا زائد زبانوں کا تبادلہ کرنا شامل ہے۔ تحولِ زبان اور ادغامِ زبان کے فرق کو روؤف پاریکھ انتہائی آسان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> دو افراد ایک زبان بولتے بولتے جب دوسری زبان میں پوری گفتگو کرنے لگیں تو یہ تحولِ زبان ہے لیکن اگر وہ آدھا جملہ یا چند الفاظ ایک زبان میں ادا کریں اور بقیہ دوسری زبان میں تو یہ عمل ادغامِ زبان ہے۔[۳۱]

افریقی ماہر لسانیات ایامبا جارجز بوکامبا (Eyamba Georges Bokamba:1944)دونوں اصطلاحات کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ایک ہی کلام میں جملے کی حدود میں الفاظ، فقروں اور جملوں کے الگ الگ قواعدی نظاموں کی ملاوٹ تحولِ زبان ہے اور ادغامِ زبان مختلف لسانی اکائیوں کی سرایت کرتا ہے جیسا کہ کسی سرگرمی میں آزاد اور پابند مارفیم اور فقرے، جملے وغیرہ۔[۳۲]

گارڈنر کلوروز پیری مین (س۔ن :Perecman) کے تشخیص کردہ ادغام کی اقسام کی فہرست پیش کرتی ہیں، جس میں الفاظ کا ادغام، مادہ اور لاحقے کا ادغام، صوت رکن (Syllable) کی آمیزش، ایک زبان کے نحو دوسری زبان کی لغت کے ساتھ یا ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان کے صوت کے ساتھ تلفظ کیے جانا۔ پیری مین نے ادغام کی ان اقسام میں سے ہر ایک سے متعلقہ تجاویز دیں جو بہ ترتیب یوں ہیں:

۱۔ پیغام کی سطح پر قائم تصوراتی تعلقات

(Conceptual relations established at essage level)

۲۔ تفاعلی سطح پر جملے سے متعلقہ الفاظ کا چناؤ

(Selection of words relevant to the sentence, at functional level)

۳۔ پوزیشن کی سطح پر بند درجہ الفاظ کا چناؤ اور تفویض کردہ صوتیاتی شکل

(Closed-class words selected at positional level, and phonological form assigned)

۴۔ صوتیاتی سطح پر بیان کردہ الفاظ کی صوتی شکل

(Phonetic form of words specified at phonetic level)

مختلف قسم کے تحول کا مشاہدہ منصوبہ بندی کی ان سطحوں میں سے ایک میں ہوتا ہے۔ عام تحولِ زبان میں ایک ہی گفت گو میں تحولِ زبان کی کئی مکمل اقسام ایک ساتھ رہ سکتی ہیں اور ان کے محرکات مختلف ہوتے ہیں۔[۲۳]

ایسا نہیں ہے کہ دوسری زبان میں اس سے متعلق علم نہیں ہے بلکہ یہ زبانوں کا غیر قواعدی اختلاط ہے۔ ان دونوں اصطلاحات کے مابین اہم فرق کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ تحولِ زبان ایسا موضوع ہے کہ جس میں متکلم جان بوجھ کر ایک سے دوسری زبان میں منتقلی کرتا ہے جب کہ ادغامِ زبان غیر ارادی طور پر صرف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ متکلم کو صحیح لفظ یا فقرے کے بارے میں پتا نہیں ہوتا۔ کئی انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اردو زبان میں مستعمل ہو کر اس کا حصہ بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ریلوے اسٹیشن (انگریزی)، پین (لاطینی)، مسلز (فرانسیسی)، گلاس (جرمنی)، تھرمومیٹر (فرانسیسی)، ٹمپریچر (لاطینی) وغیرہ۔ یہ الفاظ اپنا اردو ترجمہ رکھتے ہوئے بھی اردو زبان میں مستعمل ہیں۔

تحولِ زبان کے حوالے سے پینی لوپ گارڈنر کلوروز کی کتاب (*Code Switching: 2019*)[۲۴] کافی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز یونی ورسٹی آف لندن میں شعبۂ اطلاقی لسانیات سے وابستہ ہیں۔ وہ جرمن، فرانسیسی اور یونانی زبانوں میں روانی رکھتی ہیں۔ وہ زبان کی پالیسیوں نیز زبان اور اس کے تبادلے میں دل چسپی رکھتی ہیں۔ اقلیتی زبانوں میں دل چسپی ور تحولِ زبان میں مہارت ان کا خاصہ ہے۔ ان کی کتاب *Code Switching* سات ابواب پر مشتمل ہے۔ تمام ابواب تعارفی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے پہلا تعارفی باب پورا صرف تحولِ زبان کی فہم سے مخصوص کیا گیا ہے۔ اسی طرح باقی ابواب بالترتیب تحولِ زبان کے سماجی عناصر، مکالماتی، قواعدی اور نفسیاتی لسانیاتی پہلو سے متعلق ہیں۔

باب اول میں تحولِ زبان کو مع امثال تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں یہ بحث بھی کی گئی ہے کہ تحولِ زبان کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟ اس کی کون سی اقسام ہیں نیز تحولِ زبان کے ذیل میں کیا کیا آتا ہے؟ باب دوم میں تحولِ زبان کے استعاریت سے تعلق اور مخلوط زبانوں پر بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں تحولِ زبان کے سماجی لسانی اور ساختیاتی اثرات پر بات کی گئی ہے کہ سماجی لسانی عوامل تحولِ زبان کو سمجھنے کے لیے کلیدی چیز ہیں۔ باب سوم میں تحولِ زبان کے سماجی عناصر کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مختلف معاشروں میں تحولِ زبان کے استعمال کو مع امثال زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ باب چہارم میں مختلف گروہوں جیسے یک لسانی، ذو لسانی اور کثیر لسانی گروہوں میں تحولِ زبان کا استعمال کیوں کر کیا جاتا ہے نیز مختلف صنفوں کے درمیان تحولِ زبان کا استعمال کس طرح کیا جاتا ہے وغیرہ جیسی مباحث شامل ہیں۔ پانچویں باب میں قواعد کی اقسام اور ان اقسام کے تحولِ زبان پر اطلاق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس باب میں ماہرینِ زبان کے چند قواعدی ڈھانچوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ باب ششم میں تحولِ زبان کے نفسیاتی لسانیاتی اثرات، نفسیاتی بیماریوں، دماغ کے مختلف حصوں زبانوں کے مقام اور ذخیرے کی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ باب ہفتم میں بچوں میں تحولِ زبان کی صورتوں پر بحث مع امثال موجود ہے۔

ان ابواب میں تمام موضوعات امثال کے ساتھ تفصیلاً بیان کیے گئے ہیں۔ ان امثال کے لیے یورپی اور ایشیائی زبانوں کے علاوہ اقلیتی زبانوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ کتاب منطقی انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ تمام ابواب باہم ربط رکھتے ہیں۔ تمام مباحث مع امثال کئی ماہرین کے نظریات کی روشنی میں تفصیلاً بیان کی گئی ہیں۔ ابتدائی باب تحولِ زبان کی امثال سے وضاحت کرتا شروع ہوتا ہے اور آگے مزید ابواب تحولِ زبان کے مطالعے کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔

تحولِ زبان سے متعلق پینی لوپ گارڈنر کلوروز کے نظریات:

پینی لوپ گارڈنر کلوروز نے اپنی کتاب *Code Switching* میں تحولِ زبان کے جو نظریات پیش کیے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ تحولِ زبان کے مظاہر و نوعیت (Code Switching and Language Contact)

۲۔ تحولِ زبان کے سماجی عناصر (Social Factors in Code Switching)

۳۔ مکالمات میں تحولِ زبان (Code Switching in Conversation)

۴۔ تحولِ زبان کے قواعدی پہلو (Grammatical Aspects of Code Switching)

۵۔ تحولِ زبان کے سماجی نفسیاتی پہلو

(Psycholinguistics approaches of Code Switching)

تحولِ زبان کے مظاہر و نوعیت:

۱۔ تحولِ زبان کی اہم وجہ مختلف زبان بولنے اور سمجھنے والوں کی گفت و شنید ہے۔

۲۔ تحولِ زبان، زبان میں کہاں واقع ہوتی ہے؟

۳۔ کس حد تک ایک زبان کو دوسری زبان سے ملاتی ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے؟

۴۔ نیز اس کا استعاریت اور زبان کی تبدیلی سے کیا رشتہ ہے؟

یہ چند اہم سوالات ہیں جو تحولِ زبان کی بنیادی معلومات جاننے میں مدد فراہم کریں گے۔

تحولِ زبان مہاجر معاشروں میں نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔ اقلیتی لسانی گروہ جب اکثریتی لسانی گروہوں سے ہم کلام ہوتے ہیں تو وہ معاشرتی تبدیلی کے زیرِ اثر مختلف زبانوں کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ تحولِ زبان مستحکم ذولسانی گروہوں کی خصوصیت کے طور پر جانا جاتا ہے یعنی وہ معاشرے جہاں افراد دو یا زائد زبانیں جانتے ہیں وہاں مختلف سیاق و سباق کے ساتھ تحولِ زبان مختلف علامات کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے لہٰذا تحولِ زبان دو یا زائد زبانوں کے درمیان رابطے کا ممکنہ نتیجہ ہے۔[35]

زبانوں کے مطالعے میں اکثر تحولِ زبان کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور بعض اوقات اہم موضوع کے طور پر زیرِ بحث بھی لایا جاتا ہے۔ اس کے تحت ذولسانی گروہوں کی زبانوں کی خصوصیات کو متاثر کیے بغیر متبادل کے طور پر دوسری زبان استعمال کی جاتی ہے۔

تحولِ زبان بعض صورتوں میں قواعد کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے جو مستحکم اصولوں کے تحت نہیں ہوتا بلکہ زبان کی تبدیلی کی صورت میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر معاشروں میں تحولِ زبان کا استعمال کرنے والے (متکلم) کی عمر اور تحولِ زبان کی قسم پر منحصر ہے۔ اس لیے معاشرے میں تعلیم یافتہ نوجوان اور ان پڑھ بوڑھے کی گفت گو میں فرق ہو گا۔[36]

کئی زبانیں جو ناپید ہو رہی ہیں ان کے الفاظ دوسری زبانوں میں استعمال ہو رہے ہیں یا ان زبانوں کے الفاظ کو اپنے ساتھ شامل کر رہے ہیں۔ جیسے آسٹریا میں ڈائربل (Dyirbal) زبان جو اب ناپید ہو رہی ہے اپنے اندر انگریزی کے مفرد الفاظ کا استعمال کرتی ہے۔ جیسے so, but, now اور alright وغیرہ۔ تعلیم یافتہ انگریز نسلیں اپنے کام کے دوران روزانہ انگریزی، فرانسیسی اور پھر انگریزی کا استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں میں تجارت، مذہبی اور دیگر امور میں تحولِ زبان کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔[37]

تحولِ زبان اور استعاریت سے متعلق کئی مباحث اہمیت کے حامل ہیں۔ بہت سے حالات میں تحولِ زبان یک لفظی بھی ہو سکتا ہے گو کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔[۳۸] ذیل میں اس کی مثال دی گئی ہے:

متکلم ۱: تم نے اسے اپنی کام کی نوعیت بتائی؟

متکلم ۲: **No**

انگریزی لفظ "No" اردو جملے میں کیے گئے سوال کے جواب میں دیا گیا یک لفظی تحول ہے۔

مفرد لفظ کے ساتھ کچھ عام اسما وغیرہ مستعار بھی لیے جاتے ہیں۔ یہ حروف متعلقہ قواعدی زمرے کے سائز کی عکاسی کرتے ہیں۔[۳۹] مثلاً

چند گرلز آئیں۔

مفرد لفظ "چند" کے ساتھ اسم "گرلز" مستعار کی مثال ہے۔ یہی جملہ انگریزی میں کچھ یوں ہو گا:

Some girls came.

یوں انگریزی اردو کی جملوں میں استعمال کیے گئے الفاظ متعلقہ قواعدی جملوں کے سائز کی عکاسی کرتے ہیں۔

زبان کا کوئی سا بھی پہلو ہو اپنی ساخت سمیت مستعار لیا جا سکتا ہے۔[۴۰] یعنی ایک زبان بولتے ہوئے ہم با آسانی دوسری زبان کا کوئی سا ٹکڑا استعمال کر سکتے ہیں۔ اردو انگریزی کی ایسی بے شمار مثالیں ہم روزمرہ زندگی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً:

وہ اپنے فیصلے خود لے سکتا ہے، **He is mature enough**۔

جملے کا دوسرا حصہ انگریزی زبان سے اس کی ساخت سمیت اٹھا کر استعمال کیا گیا ہے۔

اسما قواعدی زمرے سے آزاد ہوتے ہیں بہ نسبت دیگر قواعدی الفاظ کے۔ مفرد لفظی تبدیلی کی ایک وجہ یہ ہے کہ جس زبان سے لفظ مستعار لیے جاتے ہیں ذولسانی گروہوں کی ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔[۴۱] یعنی متکلم جتنی زبانیں جانتا ہے ان کے الفاظ کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔

اسما سب سے زیادہ مستعار لیے جاتے ہیں اور منتقل ہوتے ہیں۔[۴۲] جیسا کہ اردو میں table, chair, boys, girls, animals, country, poets,writers وغیرہ جیسے متعدد اسما مستعمل ہیں۔

تمام قواعدی زمرے ممکنہ طور پر قابلِ منتقل ہوتے ہیں[۴۳] جیسے کہ اوپر انگریزی فقرے کی اردو جملے میں استعمال کی مثال دی گئی ہے۔ اسی طرح پینی لوپ گارڈنر کا کہنا ہے کہ الفاظ قواعدی طور پر اپنے خود ساختہ کردار کی بدولت منتقل ہو سکتے ہیں[۴۴] جیسا کہ اردو مکالموں میں انگریزی کی امثال کا جائزہ لیا جائے تو اسما جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے

، اس کے علاوہ حروفِ بیان(that)، حروفِ علت (that's why,so, hence)، حروفِ استفہام (what, why)، حروفِ شرط(though)، وغیرہ اور اسی طرح عربی کے حروفِ تحسین (سبحان اللہ، ماشاء اللہ) وغیرہ قابلِ منتقل ہیں۔

متکلم کسی بھی تصور کو دوسری زبان میں منتقل کر سکتا ہے۔ بعض اوقات یہ الفاظ دوسری زبان ہی کے الفاظ سمجھ لیے جاتے ہیں۔ الفاظ کے علاوہ بعض اوقات پوری پوری اصطلاحات بھی دوسری زبان میں استعمال کی جاتی ہیں۔ [۴۵]

ان الفاظ اور اصطلاحات کی امثال پروفیسر محمد ظفرالدین کے آرٹیکل میں ملتی ہیں۔[۴۶] الفاظ کی مثال کے طور پر چند الفاظ درج ذیل ہیں:

ٹیکنیکل (تکنیکی)، مسلز (عضلات)، وائرس (تشبات)، ری ایکشن (تعامل)، اور ایسے ہی اور بھی کئی الفاظ جو اپنے لیے اردو زبان کے الفاظ رکھنے کے باوجود استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس طرح اصطلاحات ملاحظہ کیجیے:

ڈی ہائڈریشن (نا آبید گی) اور کلوروپلاسٹ (سبز مائع دان) وغیرہ جیسی کئی اصطلاحات بھی اردو میں رائج ہو چکی ہیں۔

مختلف زبانوں میں جملے کی ساخت مختلف ہوتی ہے۔ قواعدی خصوصیات کی جگہ ہر زبان میں مختلف ہے[۴۷] جیسے اردو میں فعل جملے کے آخر میں مگر انگریزی میں جملے کے شروع میں اسم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

لڑکی نے کھانا کھالیا ہے۔

The girl ate the meal.

دوسری زبانوں کے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے قواعد کا خاص خیال رکھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اوقات قواعد ایک زبان کی جب کہ جملے کی ساخت دوسری زبان کی استعمال کی جاتی ہے۔[۴۸]

تحولِ زبان کے سماجی عناصر:

تحولِ زبان کے سماجی عناصر کی بات کی جائے تو یہ سماجی عناصر کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ جو فیصلہ کرتا ہے کہ آیا تحولِ زبان کسی بھی کلام میں ہوتا ہے یا نہیں۔ معاشرتی اور معاشی تغیرات سے کسی بھی زبان میں مکالمے کی صورت طے ہوتی ہے۔

پینی لوپ بتاتی ہیں کہ سماجی لسانیات کے نقطۂ نظر سے تحولِ زبان کے سماجی عناصر کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے وہ عناصر جو مخصوص متکلم اور مخصوص حالات پر انحصار کرتے ہیں کہ کون سی قسم کی گفت گو کی جا رہی ہے اور مخصوص ماحول میں متعلقہ زبان افراد کے سیاق سے تعلق، اندازِ زندگی اور طاقت کا اقتدار۔

۲۔ دوسرے وہ عناصر جو متکلم سے متعلق ہوتے ہیں انفرادی یا اجتماعی طور سماجی دائرہ کار اور تعلقات، ان کے رویے، نظریات، ذاتی نقطہ نظر اور دوسروں کے تاثرات۔

۳۔ تیسری قسم میں مکالمے کے اندر جہاں تحولِ زبان ہو رہا ہو۔ تحولِ زبان متکلم کے لیے ایک اہم مکالماتی ذریعہ ہے جو انھیں ان کا ڈسکورس بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ یک لسانی گروہوں کے پاس گفت گو کی تشکیل کے اتنے طریقے میسر نہیں ہوتے جتنے ذولسانی کے پاس۔[۴۹]

یہ درجہ بندی سماجی عناصر کی بڑی تعداد کو ایک جھلک کی صورت میں پیش کرتی ہے جو نہ تو لسانی اداروں سے وابستہ ہوتی ہے اور نہ ہی نفسیاتی لسانیاتی اداروں سے۔ ان کا اطلاق سماجی لسانیاتی ہوتا ہے جو عمر، نیٹ ورک اور شناخت جیسے عناصر سے منسلک ہے۔

دوسری تیسری جنریشن کے افراد اپنے بزرگوں سے جتنی زیادہ انسیت رکھتے ہیں اتنا ہی وہ ان کی زبان کو زیادہ جانتے ہیں۔ لسانیاتی اور سماجی لسانیاتی عوامل کا اندازہ لگانے کے لیے جہاں تحولِ زبان ہو رہا ہو وہاں مختلف حالتوں کا منظم طریقے سے موازنہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی ایسے حالات جہاں مختلف زبانوں کے درمیان مطابقت ہو، انھیں ان حالات سے جہاں زبانیں عدم مطابقت رکھتی ہوں، تقابل کرنا چاہیے۔ اسی طرح سماجی لسانیاتی عناصر کی اہمیت ایسے سماجی حالات میں جو ایک جیسے ہوں اور جو ایک جیسے نہ ہوں کے مقابلے سے جانچا جا سکتا ہے۔ یہ انتہائی مختلف فرق ہیں۔

بعض اوقات متکلم کے تحولِ زبان کا دوسرے متکلم کے تحولِ زبان پر بھی انحصار ہوتا ہے کہ اس نے پہلے مکالمے میں تحولِ زبان کا استعمال کیا ہوتا ہے۔[۵۰]

ذیل میں اس کی مثال ملاحظہ کیجیے:

- اسلام علیکم!
- وعلیکم اسلام!
- کیا حال ہے آپ کا؟
- الحمدللہ آپ سنائیے۔
- آئم گڈ۔ واٹس گوئنگ آن ناؤ آ ڈیز؟

- نتھنگ اسپیشل۔ ڈوئنگ مائی پریوئس جاب۔

درج بالا امثال میں متکلم نے عربی کا انتخاب کیا تو مخاطب نے عربی ہی میں جواب دیا۔ جب متکلم نے اردو میں تحول کیا تو مخاطب نے بھی اردو کا استعمال کیا۔ اسی طرح متکلم نے جب اردو سے انگریزی کا تحول کیا تو مخاطب نے بھی انگریزی میں تحول کیا۔

دو یک لسانی گروہوں میں تحولِ زبان کم جب کہ یک لسانی گروہ کے کسی دوسری زبان سے مکالمے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ خاندان کے افراد کی نسبت، کام کی جگہ، ساتھیوں کے ساتھ گفت گو میں تحولِ زبان زیادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی خاندان کی نسبت ایسے افراد جن سے تعامل کم ہو تحولِ زبان کا استعمال کم ہوتا ہے۔ رسمی گفت گو میں زیادہ اور غیر رسمی گفت گو میں کم استعمال ہوتا ہے۔[۵۱]

بعض اوقات اسم، فعل اور صفت وغیرہ دوسری زبان میں مستعمل ہوتے ہوئے ایک نیا مرکب بنا دیتی ہیں۔ ان کی ساخت دوسری زبانوں میں مختلف ہو جاتی ہے۔[۵۲] اردو میں اس کی مثال مرکب "لب کشا" سے لی جا سکتی ہے۔ "لب" اردو لفظ ہے جب کہ اس کے ساتھ فارسی لاحقہ "کشا" جوڑ کر نیا مرکب بنا دیا گیا ہے اسی طرح ساخت کے بدلاؤ کی مثال کے طور پر 'سیارۃ جدید'۔ عربی میں صفت بعد میں اور موصوف پہلے لگایا جاتا ہے لیکن اگر ہم "جدید' صفت کو اردو میں استعمال کریں گے موصوف سے پہلے استعمال ہو گی جیسے 'جدید گاڑی"۔ تحول زبان ایسے معاشروں میں بھی وجود میں آتی ہے جہاں اقلیتی لسانی گروہ اکثریتی لسانی گروہوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔

گمپرز اقلیتی زبان کو **We code** اور اکثریتی زبان کو **They code** کا نام دیتے ہیں۔[۵۳] اقلیتی گروہ، گروہ کے اندر غیر رسمی سرگرمیاں رکھتے ہیں اور اکثریتی گروہ رسمی سرگرمیاں گروہ سے باہر رکھتے ہیں۔ مثلاً گھر کے اندر مادری زبان کا استعمال *We Code* ہے اور باہر سکول، کالج اور کام کی جگہوں میں قومی یا سرکاری زبان کا استعمال They Code ہے۔ اکثر ایک ہی کلام کے اندر دونوں اصطلاحات استعمال ہو رہی ہوتی ہیں۔

مکالمات میں تحولِ زبان:

پینی لوپ گارڈنر نے مکالمات میں تحولِ زبان کے تین سماجی لسانیاتی عزائم درج کیے ہیں۔

۱۔ مکالماتی / اشاراتی (علامتی) محرکات (Conversational/ Pragmatic motivations)

۲۔ سماجی نفسیاتی اثرات (Social Psychological aspects)

۳۔ صنف (Gender)[۵۴]

ا۔ مکالماتی / اشاراتی (علامتی) محرکات:

گمپرز تحولِ زبان کو سیاق و سباق کے ساتھ زبانی یا اشاراتی علامتوں سے منسلک کرتے ہیں اور کسی پیغام کے لیے وضاحتی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔[۵۵] کسی بھی مکالمے میں اقتباس، مخاطب کی تفصیلات، رکاوٹ، اعادہ / منتقلی، تعلیم، اعتراضات، ذاتیات کی صورت میں تبدیلی ممکن ہے۔[۵۶]

کیرول مائرس اسکاٹن (Carol Myers Scotton:1934) نشان داری کا نمونہ پیش کرتی ہیں جس کے تحت افعال کو زیادہ جامع نمونے میں ختم کرنے کے کوشش کی جاتی ہے۔ خاندان کے افراد کے مابین مکالمے کے دوران مقامی زبان میں منتقلی غیر نشان دار جب کہ عوامی مکالمے کے دوران مقامی زبان میں منتقلی نشان دار انتخاب ہے۔ اسکاٹن ضابطہ ہائے گفت گو بھی بیان کرتی ہیں جو نشان دار انتخاب کے مساوی ہوتا ہے جس میں شرکا کے مابین متوقع سماجی فاصلے کے انعقاد میں تبدیلی پر گفت و شنید کی جاتی ہے۔[۵۷]

ایسا معاشرہ جہاں تحولِ زبان ہوتا ہے وہاں زبانوں میں فرق مقامی بولیوں، سماجی زبان اور اندازِ گفت گو کے فرق سے کم نمایاں ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں مخصوص اثرات کے تحت دو زبانوں کا تقابل تحولِ زبان کے استعمال کا ایک طریقہ ہے۔ کسی معاشرے میں زبان کی مختلف اقسام کو کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے کسی بھی گروہ میں حقیقی لسانی طریقوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ زبان کا انتخاب خاندان میں ان کی لسانی ترجیحات اور اقتدار کے ڈھانچے کی عکاسی کرتا ہے۔ یک لسانی گروہ کی گفتگو میں تحولِ زبان کو سمجھنے میں مشکل در پیش آتی ہے لہٰذا بات کو دوسری زبان میں دہرانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ پشتو زبان کو لیا جائے تو قبائلی لوگ جو صرف پشتو ہی جانتے ہیں، اردو میں کی گئی بات کو سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں زبانیں آپس میں مطابقت بھی نہیں رکھتیں۔ جوان اور بزرگ نسل کے درمیان زبان کی ترجیح ان کے مابین ہم آہنگی کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔[۵۸]

یک لسانی گروہوں میں افعال کی تکمیل کے لیے تاثرات جب کہ ذو لسانی گروہوں میں تحولِ زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔[۵۹] یک لسانوں کے پاس چوں کہ بات کو بیان کرنے کے لیے ایک ہی زبان ہوتی ہے لہٰذا وہ اپنے چہرے کے تاثرات یا کچھ الفاظ پر زور دے کر یعنی لہجے کے اتار چڑھاؤ کا سہارا لیتے ہیں۔ جیسا کہ پینی لوپ گارڈنر وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ یک لسانی گروہوں میں متکلم اولین مکالمے میں آواز کی سُر میں تبدیلی کر دیتا ہے۔ انگریزی میں اکثر کم رکھی جاتی ہے۔ اس میں دوسری خصوصیات جیسے چہرے کے تاثرات یا نظروں کے زاویوں میں تبدیلی وغیرہ بھی آجاتی ہے۔ اس کے برعکس ذو لسانی یا کثیر لسانی گروہ دوسری زبانوں کے الفاظ استعمال کر لیتے ہیں جو

ان کے جذبات کی صحیح عکاسی کر سکیں۔ پینی لوپ بتاتی ہیں کہ یک لسانی اور ذو لسانی گروہوں کی گفت گو کا موازنہ کرتے ہوئے منتقلی کی یہ چار اقسام نظر آتی ہیں:

۱۔ معاونین (Asides)

۲۔ اقتباسات (Quotations)

۳۔ منتقلی (Reiterations)

۴۔ فقرہ (Clauses)

معاونین میں مکالمے کا یہی حصہ شامل ہے جس میں باقی ماندہ جملہ اپنے آپ سے کہا جاتا ہے اور مخاطب کو بھی سنانا مقصود ہوتا ہے۔ زبان کا تبدل اور جملوں کی دہرائی ایک ہی وقت میں کئی ڈسکورس بناتے ہیں۔

اقتباس کی تشکیل تحولِ زبان کا ایک اہم عنصر ہے۔ بعض اوقات اقتباس دو دفعہ بھی تشکیل دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ اقتباسی فعل کے ساتھ پھر زبان میں تبدیلی کے ساتھ۔ تحولِ زبان دونوں اقتباسات کے درمیان خود کو ظاہر کرنے کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ متکلم کو ایک دوسری زبان بھی مہیا کرتا ہے جس میں وہ اپنا مطلب زیادہ اچھے سے بیان کر سکتا ہے۔ یک لسانی زبان میں مکالمہ کرتے ہوئے صوتی تاثرات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی جن الفاظ پر مقصود ہو متکلم زور دے دیتا ہے اور جن کو چاہے آہستہ بولتا ہے۔ [۱۰]

پینی لوپ گارڈنر نے معاونین اور اقتباس کی وضاحت تو کی ہے لیکن باقی دو اقسام منتقلی اور فقرہ پر بات نہیں کی۔

۲۔ سماجی نفسیاتی اثرات:

تحولِ زبان کے سماجی نفسیاتی پہلوؤں میں باقی پہلوؤں کی نسبت کم کام کیا گیا ہے۔ اگرچہ ماہرینِ سماجی نفسیات کے پیش کردہ تصورات اس کی تفہیم اور نتائج سے عین متعلق ہیں۔ تحولِ زبان دو گروہوں کے درمیان سمجھوتے کا کام کر سکتا ہے۔ یہ متکلم کی ترجیحی زبان کو قائم کرنے کا ممکنہ طریقہ ہے جہاں متکلم اور مخاطب مختلف مفاہیم اور معنی اٹھائیں۔ عین ممکن ہے کہ جہاں دو متکلموں کے درمیان ان کی اہلیت اور متعلقہ زبان میں کوئی مماثلت نہ ہو۔ یہ متکلم کو مکالمے میں ایک ہی زبان کے استعمال پر نہیں اکساتا جیسے سیاست دانوں کی تقاریر اور کامیڈین کے لطیفے۔ خاص کر میڈیا میں جہاں ان کو دیکھنے والے کثیر لسانی لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے ٹی وی چینل اس کی عام مثال ہیں۔ اس کا سب سے اہم فنکشن یہ ہے کہ متکلم مختلف مخاطبوں کے ساتھ ان کی مناسبت سے کسی بھی زبان کا استعمال کرتا ہے۔

تحولِ زبان تعلیم یافتہ پیشہ ورانہ لوگوں پر منحصر ہوتا ہے۔ مختلف پیشوں سے منسلک لوگوں میں تحولِ زبان زیادہ ہوتا ہے۔ تحولِ زبان آہستہ آہستہ ثقافتی، نسلی، موسیقیائی، مذہبی اور متعدد سیاق و سباق میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔[۱۱]

صنف:

صنف سب سے اہم سماجی لسانی پہلو ہے لیکن مختلف صنفوں کے درمیان لسانی کارکردگی کا مطالعہ تیزی سے ناپید ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں پینی لوپ کا کہنا ہے کہ عورتوں میں مردوں کی نسبت تحولِ زبان زیادہ ہوتا ہے لیکن بعض تحقیقات مردوں میں اس کا زیادہ استعمال بتاتی ہیں۔ وہ مثال دیتی ہیں کہ لندن یونانی قبرصی معاشرے میں نوجوانوں کی تنظیم کے تیس انٹرویو منعقد کیے گئے اور ان تمام کی ریکارڈنگ کی گئی۔ یہ اجلاس غیر رسمی نوعیت کے ہوتے اور شرکاء میں سے کسی نہ کسی کے گھر یا چائے خانوں پر رکھے جاتے۔ ان اجلاس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ۵ مرد اور ۵ خواتین شامل ہوتے جن کی عمریں تئیس سال سے انتیس کے درمیان تھیں اس تمام جائزے سے اخذ کیا گیا کہ یونانی معاشرے میں تحولِ زبان عورتوں میں عام ہے لیکن مختلف مقاصد کے لیے مرد اور عورتیں دونوں اس کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔[۱۲]

پینی لوپ گارڈنر تحولِ زبان سے مطابقت رکھنے والی تین صورتوں کا بتاتی ہیں:

۱۔ مزاح کے لیے تحولِ زبان کا استعمال:

یعنی ایسی زبان میں مزاح کا ٹکڑا مکالمے کے ساتھ جوڑنا جو مخاطب کو سمجھ میں نہ آئے۔[۱۳] اس کی عام مثال پنجابی زبان بولنے والوں کی جگتیں ہیں جنھیں دوسری زبان کے افراد کم ہی سمجھ پاتے ہیں۔

۲۔ تعلق بنانے کے لیے:

دو گروہوں کے درمیان تعلق مستحکم کرنے کے لیے بھی تحولِ زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دو مختلف زبانوں سے وابستہ افراد کا کسی مشترکہ سرگرمی میں ایک دوسرے کی زبان میں گفتگو کرنے کی سعی۔[۱۴]

یا پھر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ دو افراد جو ایک ہی لسانی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں اور رسمی تفاعل کے پیشِ نظر وہ قومی زبان کا استعمال کر رہے ہوں لیکن پھر باہم تعلق مستحکم کرنے کے پیشِ نظر اپنی علاقائی زبان کا استعمال شروع کر دیں۔ پاکستانی معاشرے میں یہ صورت عام مشاہدے میں آتی ہے۔

۳: کوئی بات سمجھ نہ آ رہی ہو تو تب تحولِ زبان کا استعمال کر کے مفہوم واضح کرنا:[۱۵]

بعض اوقات دو مختلف زبانیں بولنے والے افراد کسی گفتگو کے دوران ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے میں دقت محسوس کرتے ہیں لہٰذا وہ ان کی زبان کے الفاظ کا اپنی زبان میں استعمال کر لیتے ہیں تا کہ بات کا مفہوم واضح ہو سکے۔

پینی لوپ گارڈنر کا کہنا ہے کہ عام طور پر کسی بھی کمیونٹی میں تحولِ زبان کے اوپر دی گئی صورتوں میں استعمال کو خواتین سے مخصوص کر دیا جاتا ہے حالاں کہ یہ کسی بھی طرح خواتین سے مخصوص نہیں ہیں۔[۲۶]

تحولِ زبان کے قواعدی پہلو:

پینی لوپ لکھتی ہیں کہ نظریاتی قواعد کے تحولِ زبان پر اطلاق سے پہلے ضروری ہے کہ ہم قواعد کی اقسام کو جان لیں کہ تحقیق میں قواعد کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ذیل میں اس کی چار اقسام دی گئی ہیں۔

۱۔ تقعیدی (Prescriptive)

۲۔ آفاقی (Universal)

۳۔ رسمی (Formal/ Generative)

۴۔ وظیفوی (Functional)[۲۷]

تحولِ زبان کی قواعد پر کام کرنے والے ماہرین ایک تقعیدی نمونہ پیش کرتے ہیں تا کہ عالمی معمولات کو بے نقاب کیا جا سکے۔ تحولِ زبان کی قواعد کی وضاحت کا نتیجہ یہ ہے کہ تحولِ زبان کے استعمال کا صحیح۔غلط یا کم از کم ممکن۔ ناممکن طریقہ معلوم ہوتا ہے۔[۲۸] اکثر مختلف زبانوں کے الفاظ کا مرکب تحولِ زبان نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اردو میں کئی عربی۔فارسی، اردو۔عربی یا اردو فارسی تراکیب استعمال ہوتی ہیں وہ تحولِ زبان کے ذیل میں نہیں آتی۔ مثال کے طور پر:

عربی۔فارسی ترکیب "کتب خانہ"۔ معیاری تحریروں پر لاگو ہونے والے قواعد کے منظم اصولوں کو غیر مرکوز سیاق و سباق کی حامل گفتگو پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔

آفاقی قواعد (Universal Grammer) میں جوں جوں ترقی ہوتی ہے ویسے ہی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ محسوسات کے ساتھ ساتھ یہ بدلتی رہتی ہیں۔ اس میں انفرادی قواعد کے اصول لیے جا سکتے ہیں۔ آفاقی قواعد جو چومسکی کی قواعد بھی کہلاتی ہے، یہ قواعد کے بجائے میٹا گرامر کہلاتی ہے۔ چومسکی اس ضمن میں E Language اور I Language کے درمیان امتیاز کی وضاحت کرتے ہیں۔ E Language معاشرے میں پائی جانے والی گفت گو

اور I Language افراد کے ذہن میں پائے جانے والے اجزا ہیں جو کسی زبان کو جانتے ہیں۔ اس کے مطابق تحولِ زبان ناخالص ہے اور کسی بھی انتخاب کی نمائندگی نہیں کرتا۔[۶۹]

رسمی قواعد میں ساخت تشکیل دی جاتی ہے اور باقاعدہ گردانیں بنائی جاتی ہیں۔ ایک پیچیدہ جملے کی بنی ساخت میں اظہار کیا جاتا ہے جو خاص طور پر مخصوص زبان کی تفصیلی قواعد فراہم کرتے ہیں۔[۷۰]

تفاعلی قواعد میں دو زبانوں کی قواعد کو مکس کیا جاتا ہے۔ معنی و مفہوم، قواعد اور نحو کے درمیان سخت تقسیم اس فریم ورک کی تقسیم میں نہیں پہچانی جاسکتی۔[۷۱]

قواعدی ماڈل کا تحولِ زبان پر اطلاق:

قواعدی ماڈل کے تحولِ زبان پر اطلاق کے مطالعے میں تین اہم رجحانات کو ممتاز کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تغیر پذیر نقطۂ نظر (Variationist approach)

۲۔ پیداواری نقطۂ نظر (Generativist approach)

۳۔ تخلیقی نقطۂ نظر (Production approach)

ان سب کی تفصیل ذیل میں دی گئی ہے۔

تغیر پذیر نقطۂ نظر:

تغیر پذیر نقطۂ نظر ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۰ء کے درمیان وجود میں آیا جب قواعد بنانے کی مختلف کاوشیں کی گئیں جو عالمی رکاوٹوں پر مبنی تھی جہاں تحولِ زبان جملے میں ہو سکتا تھا۔ تحولِ زبان جب پہلی دفعہ قواعدی لیول پر مطالعہ کیا گیا تو یہ مشاہدہ کیا گیا کہ ان جملوں میں تحولِ زبان بے ترتیب نقاط پر واقع نہیں ہوا تھا۔ مختلف قسم کی منتقلی جیسے لغوی منتقلی عام ہے، اسم ضمیر اور فعل کے درمیان منتقلی بہت کم ہوتی ہے۔ پینی لوپ بتاتی ہیں کہ منتقلی میں آفاقی نوعیت کی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ کھلا وامارفیم رکاوٹیں: (The Open Morpheme Constraints)

یہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ آزاد اور پابند۔ پابند مارفیم اور لغوی شکل کے درمیان منتقلی منع ہے یعنی کہ لفظ کا مادہ ایک زبان کا اور پابند مارفیم دوسری زبان کا۔

۲۔ مترادف رکاوٹیں: (The Equivalence Constraints)

جہاں دو زبانوں کی ساخت پر فرق ہو وہاں تحولِ زبان واقع نہیں ہو سکتا[۷۲] مثلاً

"اس نے جدید گاڑی خریدی۔"

درج بالا مثال میں اردو زبان کے قاعدے کے مطابق صفت اور موصوف کا استعمال ہوا ہے یعنی " جدید گاڑی"۔

لفظ "**جدید**" عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں اس کا استعمال یوں ہوتا ہے:

"سیارۃ جدید"۔

یعنی موصوف پہلے اور صفت بعد میں آتی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اوپر کی مثال میں یہ رکاوٹ استعاریت کی وجہ سے ہوئی ہے کیوں کہ ہم زبان تبدیل نہیں کر رہے ہوتے بل کہ مستعار لے رہے ہیں۔

پیداواری نقطۂ نظر:

ا۔ متابعت(Government):

پیداواری نقطہ نظر جو ۱۹۸۰ء میں بنایا گیا۔[۴۳] اس میں مطابعت کے لحاظ سے تحولِ زبان میں رکاوٹوں کی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں عام منتقلی کا محاسبے کا کام ہے جیسے فعل اور متعلق فعل اور اسم اور فعل کے درمیان۔[۴۴]

ب۔ منسوخ کرنا:(To Cancel)

تحولِ زبان کے علاوہ کوئی چیز بھی مخلوط گرامر میں رکاوٹ نہیں ہے۔ اس میں تفاعلی مرکز یعنی functional head ایک زبان میں اور تبصرہ(compliment) دوسری زبان میں کیا جاتا ہے۔[۴۵] جیسے:

میں نے تمھیں بتایا تھا کہ they will come in evening ۔

درج بالا جملے میں اردو زبان میں کہا گیا جملے کا حصہ تفاعلی مرکز ہے اور انگریزی زبان میں کہا گیا حصہ تبصرہ ہے۔

تخلیقی نقطۂ نظر:

تحولِ زبان فریم اور قالب (matrix) میں ملوث ہوتا ہے جس میں دوسری زبان کے عناصر سرایت کر سکتے ہیں۔ یہ درجہ بندی کا فریم ورک فراہم کرنے اور مجوزہ معاہدے میں رکاوٹوں کو باندھنے میں پچھلی رکاوٹوں سے اس طرح مختلف ہے:

الف۔ تحولِ زبان میں مارفیم کی مختلف اقسام کا کردار: تمام تحولِ زبان میں ایک غالب زبان ہوتی ہے جو قالبی زبان یا بنیاد ہے۔ یہ جملے میں مارفیمی نظام مہیا کرتی ہے۔

ب۔ <u>نفسیاتی لسانیاتی تصور کے محرکات</u>: زبان کے عمل (processing) میں ایک فریم کی تعمیر ہوتی ہے جو عام طور پر دو زبانوں میں سے ایک قالبی زبان کے ذریعے وضع کی جاتی ہے جس میں دوسری زبان کے عناصر کو شامل کیا جاتا ہے۔[76]

درج بالا قواعدی پہلوؤں کی مزید وضاحت مقالے کے پیشِ نظر باب چہارم میں کی جائے گی۔

زبان کے نفسیاتی لسانیاتی پہلو:

زبان کے نفسیاتی لسانیاتی پہلوؤں پر گو کہ لسانیات میں کم کام کیا گیا ہے لیکن ذیل میں چند مباحث کا سرسری تذکرہ ملتا ہے۔ نفسیاتی لسانیات یہ پتا لگاتی ہے کہ کسی مکالمے میں کی جانے والی بات کس معنی میں کہی جاتی ہے اور دوسرا سننے والا اسے کیسے لیتا ہے۔ مادری زبان کچھ اور ہو اور کوئی دوسری زبان صرف اس لیے سیکھی جائے کہ اس سے ہمارا پالا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک طالب علم عربی کو بہ طور مضمون پڑھتا ہے تو وہ عربی کو اس حد تک سیکھے گا کہ مضمون اس کی سمجھ میں آ جائے۔ پینی لوپ اس کی مثال اس کے لیے ایسے دو افراد کی مثال دیتی ہیں جن میں سے ایک ہسپانوی زبان سمجھتا ہے اور دوسرا فرانسیسی۔ آپ کو دونوں زبانیں آتی ہیں۔ ہسپانوی والے سے بات کرنے کے بعد جب آپ وہی بات فرانسیسی بولنے والے کو بتائیں گے تو دونوں زبانیں مکس ہو سکتی ہیں یعنی قواعد کے اعتبار سے فرانسیسی بولتے ہوئے ہسپانوی کے اصول بھی ڈال سکتے ہیں۔ جب کہ ایک ماہر شخص شاید تحولِ زبان کے دوران قواعد، الفاظ کو ملنے نہ دے مگر ایسا شخص جس نے حال ہی میں دونوں زبانیں سیکھی ہوں گی وہ قواعد اور الفاظ کو ملا سکتا ہے۔ تحولِ زبان کا یہ فائدہ ہے کہ آپ کو دو زبانیں آتی ہیں اور آپ دونوں پر عبور رکھتے ہیں۔ ایک زبان میں بولتے بولتے جب آپ کسی کو کچھ سمجھانے کے لیے کسی اور زبان کے الفاظ استعمال کریں یعنی اردو بولتے ہوئے اگر کوئی مناسب لفظ ذہن میں نہ آ رہا ہو تو اس کی جگہ انگریزی کا لفظ بول سکتے ہیں۔ پہلی زبان سے دوسری زبان میں تحولِ زبان کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ زبان کی قواعد، اصول اور چند دوسرے عناصر کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اتنی صلاحیت درکار ہوتی ہے کہ دوسری زبان کو جاری رکھا جا سکے۔[77]

پینی لوپ لکھتی ہیں کہ دماغ کے عوارض کا مطالعہ روایتی طور پر دماغ میں زبان کی بنیادی نمائندگی کے بارے میں معلومات کے ذرائع کے طور پر استعمال ہوتا رہتا ہے۔ ذو لسانی گروہ جو نفسیاتی فتورِ نطق[78] (Aphasia) سے گزرتے ہیں اور زبان کی صلاحیت کھو دیتے ہیں اس کا مطالعہ صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ وہ زبان کے طبعی مقام اور ان کے تفاعلی عمل کا پتا لگا لیں گے۔[79]

نفسیاتی لسانیاتی مطالعے میں دل چسپ واقعات کی ایک بڑی فہرست کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جذباتی عناصر کافی اثرات مرتب کرتے ہیں کہ کوئی کیسے زبان سیکھتا ہے اور ان کا استعمال کرتا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی ایک فاصلاتی تفاعل عطا کرتا ہے جو متکلم کو اجازت دیتا ہے کہ وہ ایسے عوامل کو صرفِ نظر کرے جو عدمِ اطمینان پیدا کرتے ہیں۔ دوسری زبان سے پھر پہلی زبان میں منتقلی متکلم کو مزید جذباتی بناتی ہے۔ [۸۰]

دماغ میں زبان کے مقام سے متعلق علم کی ایک بڑی تاریخ پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں ایک اہم پیش رفت ہوتی ہے جو پال بروکا (Paul Broca: 1824- 1880) کے کام سے سامنے آئی۔ ان کا کہنا ہے کہ دماغ میں بایاں نصف کرّے کا سامنے والا تیسرا حصہ زبان کی پیدائش کا اہم مرکز ہے۔ ویرک نے الفاظ کے ملتے جلتے عکس اور آوازوں کے لیے مختلف ساختی راستے اور یادداشت کے حصے کی نشان دہی کی۔ تب سے اب تک کئی انواع کی تحقیقات نے ثابت کیا کہ دماغ کے بائیں نصف حصے میں زبان سے متعلق امور شامل ہیں خواہ وہ دائیں حصے کو زیادہ استعمال کرنے والے افراد ہوں یا بائیں۔ چناں چہ زبان کا بڑا تناسب بائیں نصف حصے میں موجود ہے۔ مختلف زبانیں دماغ کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں یہ جاننا مشکل ہے۔ دو لسانی گروہوں کے لیے ثانوی زبان بولتے ہوئے اپنی بنیادی زبان کو روکنا مشکل امر ہے۔ اس کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے جب کہ ثانوی زبان سے واپس بنیادی زبان میں آنا نسبتاً آسان ہے۔ دولسانی دماغ میں اگر زبانیں الگ الگ ہوتیں تو نہ ترجمہ ہو سکتیں اور نہ زبانوں کی منتقلی ممکن ہوتی۔ اگر یہ مکمل طور پر مربوط ہوئے تو ہر وقت تصادمی طور پر زبانوں کی منتقلی ہوتی رہتی اور ایک ہی زبان میں بات کرنا ممکن نہ ہوتا۔ [۸۱]

سماجی لسانیات کی طرح نفسیاتی لسانی مطالعے کی اکثریت یک لسانیت پر بنیاد رکھتی ہے تاہم دولسانی مطالعہ زبانوں کے ذخیرے اور پیدائش کے کچھ خاص امور سامنے لاتا ہے۔ بلوغت کے بعد زبان سیکھی جائے تو اس کا دماغ کے دائیں نصف کرّے میں ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے جب کہ مجموعی طور پر زبان دماغ کے بائیں نصف کرّے میں افعال کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ بچے جنھیں دماغ کی کوئی بیماری لاحق ہو جائے ان میں زبان کا مرکز دماغ کے بائیں سے دائیں حصے میں منتقل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح افراد میں فالج یا کوئی چوٹ لگ جانا، خون کی گردش کم ہونے یا شریانوں کے پھٹ جانے سے بایاں آدھا حصہ متاثر ہو تو اس صورت میں ممکن ہے کہ مریض کوئی نئی زبان سیکھیں جو ان کے لیے بالکل نئی ہو اور مادری زبان سے بالکل الگ ہو۔ تھکاوٹ، بے چینی اور ذہنی دباؤ میں بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی لاشعوری طور پر اختیار کر لی جاتی ہے۔ [۸۲]

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحولِ زبان سے متعلق بنیادی مباحث ہیں جو پینی لوپ گارڈنر کے ہاں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ چوں کہ اس مقالے کے باقی ابواب میں انھی نظریات کا اطلاق مقصود ہے اس لیے اگلے تمام ابواب

میں مذکورہ نظریات کے تناظر میں سید کاشف رضا کے ناول کے متن کو پرکھتے ہوئے اس کا لسانیاتی تجزیہ کرنے کی سعی کی جائے گی۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ عامر علی خان،فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۱۰ء)،ص ۱۴۱۔

۲۔ ولیم ڈاؤنس، *Language And Society* (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس،۱۹۹۸ء)، ص ۹۔

۳۔ محمد قاسم بگھیو،لسانیات تا سماجی لسانیات،مترجم خوشی محمد جاوید(لاہور: فکشن ہاؤس پبلشرز، ۲۰۱۹ء)، ص ۳۸۔

۴۔ رؤف پاریکھ،لسانیات کے بنیادی مباحث(کراچی: اردو بازار،۲۰۱۹ء)، ص ۱۷۳۔

۵۔ فش مین، جوشوا اے، *The Sociology of Language* (نیو یارک: نیو بری ہاؤس پبلشرز،۱۹۷۲ء)، ص ۴۶۔

۶۔ آر اے ہڈسن، *Sociolinguistics*(کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس،۱۹۹۶ء)، ص ۴۔

۷۔ https://www.hup.harvard.edu/catalog.php?isbn=9780674530928 تاریخ ملاحظہ ۵ فروری ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔

۸۔ رؤف پاریکھ،لسانیات کے بنیادی مباحث، ص ۱۹۳۔

۹۔ https://en.m.wikipedia.org/wiki/Linguistic-competence، تاریخ ملاحظہ ۵ فروری ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۲:۰۰ بجے۔

۱۰۔ برنارڈ سپالسکی، *Sociolinguistics*(آکسفرڈ: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس،۱۹۹۸ء)۔

۱۱۔ مریم میئرہوف، *Introducing Sociolinguistics*(نیویارک: روٹلیج،۲۰۰۶ء)، ص ۱۱۴۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۱۳۔ https://ur.m.wikipedia.org/wiki/%D9%85%D8%B4%D8%B1%D9%82%DB%8C_%DB%A8%D8%B1%D8%A8%D8%B1_%D8%B1_%D8%B2%D8%A8%D8%A7%D9%86%DB%8C%DA%BA، تاریخ ملاحظہ ۱۲ مارچ ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۱:۰۰ بجے۔

۱۴۔ https://ur.myubi.tv/1718-what-language-did-they-speak-in-ancient-rome، تاریخ ملاحظہ ۱۵ مارچ ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔

۱۵۔ https://free.facebook.com.Dilchasp.info?photos?a.4618147 9244534?1775654032527264/?_rdc=1&_rdr، تاریخ ملاحظہ ۱۵ مارچ ۲۰۲۲ء، بوقت ۲:۰۰ بجے۔

۱۶۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، *Code Switching* (نیویارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۹ء)۔

۱۷۔ مریم میئر ہوف، *Introducing Sociolinguistics*، ص۱۱۵۔۱۱۶۔

۱۸۔ رونالڈ ورڈا، *An Introduction To Sociolinguistics* (بلیک ویل: سسیکس، ۲۰۱۶ء)۔

۱۹۔ نینسی ٹیز، "Speech and Society among the IndonesianElite, A Case Study of a Multilingual Community" مشمولہ *Anthropological Linguistics*، ٹرسٹیز آف انڈیانا، ۱۹۶۷ء۔

۲۰۔ رؤف پاریکھ، لسانیات کے بنیادی مباحث، ص۲۰۹۔۲۱۰۔

۲۱۔ رومینی سوزین، *Language in Society: Am Introduction to Sociolinguistics* (آکسفرڈ: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء)۔

۲۲۔ http://core.ac.uk/download/pdf/19566896.pdf، تاریخ ملاحظہ ۱۸ مارچ ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔

۲۳۔ رومینی سوزین، *Language in Society: Am Introduction to Sociolinguistics*، ص۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ گمپرز اینڈ بلوم، *Sociolinguistics and Communication in Small Groups* (پینگوئن بکس، ۱۹۷۲ء)۔

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ عامر علی خان، فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات، ص۴۱۔

۲۸۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، *Code Switching*، ص۱۲۔۱۳۔

۲۹۔ https://en.m.wikipedia.org/wiki/Code-mixing

۳۰۔ مریم میئرہوف، *Introducing Sociolinguistics*،ص۱۰۔

۳۱۔ رؤف پاریکھ،لسانیات کے بنیادی مباحث،ص۲۰۹۔

۳۲۔ ای.جی.بوکاما۔ *"Are these Syntactic Constraints on Code Mixing"* مشمولہ
ورلڈ انگلشز،شمارہ۸،(بلومز بری پبلشرز،۱۹۸۹ء)۔

۳۳۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، *Code Switching*،ص۱۲۵۔

۳۴۔ ایضاً،ص۱۲۵۔

۳۵۔ ایضاً۔ص۲۰۔

۳۶۔ ایضاً،ص۲۴۔

۳۷۔ ایضاً،ص۲۴۔

۳۸۔ ایضاً،ص۲۴۔

۳۹۔ ایضاً،ص۲۴۔

۴۰۔ ایضاً،ص۳۰۔

۴۱۔ ایضاً،ص۳۰۔

۴۲۔ ایضاً،ص۳۰۔

۴۳۔ ایضاً،ص۳۰۔

۴۴۔ ایضاً،ص۳۰۔

۴۵۔ ایضاً۔ص۳۱۔

۴۶۔ https://www.facebook.com/100002968263932/posts/1319906278118302/

۴۷۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، *Code Switching*،ص۳۵۔

۴۸۔ ایضاً،ص۴۲۔

۴۹۔ ایضاً،ص۴۲۔

۵۰۔ ایضاً،ص۴۵۔

۵۱۔ ایضاً،ص۸۵۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۵۶۔۵۷۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۶۹۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۶۹۔

۵۷۔ ایضاً۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۷۳۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۷۴۔۸۳۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۶۳۔ ایضاً، ص ۸۵۔۸۶۔

۶۴۔ ایضاً۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۸۶۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۸۵۔

۶۷۔ ایضاً، ص ۹۲۔۹۴۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۹۲۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۹۳۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۷۱۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۷۲۔ ایضاً، ص ۹۵۔۹۶۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۷۵۔ ایضاً، ص ۹۸۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۷۸۔ زبان کے مسائل میں سے ایک ذولسانی افیسیا ہے یعنی ایسی بیماری جو زبان پیدا کرنے یا سمجھنے کی نااہلی ہے۔ یہ دماغی خرابی کے عمل کے نتیجے میں ہوتی ہے۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

باب دوم:

چار درویش اور ایک کچھوا: ایک تعارفی مطالعہ

باب دوم:

چار درویش اور ایک کچھوا: ایک تعارفی مطالعہ

اکیسویں صدی میں کئی نوجوان ادیب سامنے آئے جنھوں نے اپنے ناول میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر تنوع پیدا کیا اور ہئیت، زبان و بیان کے جدید تجربات کیے۔ انھی میں سے ایک ادیب سید کاشف رضا ہیں جن کا شمار عہدِ حاضر کے نوجوان ادیبوں میں ہوتا ہے۔

سید کاشف رضا ۱۰ مئی ۱۹۷۳ء میں پی۔اے۔ایف بیس سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ چوں کہ ان کے والد پاک فضائیہ میں ملازم تھے لہٰذا ان کا بچپن پاک فضائیہ کے مختلف مراکز میں گزرا۔ راول پنڈی سے انھوں نے بی اے کیا اور پھر کراچی یونی ورسٹی سے بالترتیب انگریزی ادب اور انگریزی لسانیات میں ماسٹرز کیا۔ پیشے کے اعتبار سے بہ طور صحافی الیکٹرانک اور اخباری میڈیا سے منسلک ہیں۔ ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۲ء تک مختلف نیوز چینلز سے وابستہ رہے۔ ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۵ء تک "جیونیوز" کے ساتھ رپورٹر اور پروڈیوسر کے طور پر منسلک رہے پھر ۲۰۰۵ء سے ۲۰۰۷ء تک "آج نیوز" میں سینئر پروڈیوسر رہے۔ ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۸ء تک "نیوزون" میں نیوز ایڈیٹر اور حالاتِ حاضرہ سے وابستہ رہے۔ ۲۰۰۸ء سے تادمِ تحریر وہ "جیونیوز" کے لیے پروڈیوسر، سینئر پروڈیوسر اور ایگزیکٹو پروڈیوسر کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اگر سید کاشف رضا کی ادبی خدمات کا ذکر کیا جائے تو وہ شاعر، فکشن نگار اور مترجم ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے محبت کا محلِ وقوع اور ممنوع موسموں کی کتاب بالترتیب ۲۰۰۳ء اور ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئے۔ انھوں نے نوم چومسکی کی کتاب *Culture of Terrorism* کا ترجمہ دہشت گردی کی ثقافت کے عنوان سے ۲۰۰۳ء میں کیا اور اور ۱۱-۹ کا ترجمہ گیارہ ستمبر کے عنوان سے ۲۰۰۴ء میں کیا۔ اس کے علاوہ محمد حنیف کے ناول *A Case of Exploding Mangoes* کا ترجمہ پھٹتے آموں کا کیس کے نام سے ۲۰۱۹ء میں کیا۔ سید کاشف رضا کئی ممالک کا سفر کر چکے ہیں اور سیاحت سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے کئی سفر نامے[۱] لکھے جو جریدے "آج" میں شائع کروا چکے ہیں۔ ان کے سفر ناموں کا مجموعہ دیدم استنبول اور دیگر سفری کہانیاں کے نام سے زیرِ ترتیب ہیں۔ سید کاشف رضا مختلف اخبارات اور ویب گاہوں کے لیے اردو اور انگریزی میں مزاحیہ اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ نیز ان کے سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے رہتے

ہیں۔ انھوں نے کئی کتابوں پر تبصرے بھی کیے جو ادبی میگزین کراچی ریویو جس کے وہ مدیر بھی ہیں، میں شائع ہوا۔ یہ رسالہ کتابوں کے تبصروں ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ کاشف رضا کی جو کتابیں زیرِ ترتیب ہیں ان میں اقبال احمد کے مضامین، آزادی اور مہمان شامل ہیں۔

چار درویش اور ایک کچھوا ان کا پہلا ناول ہے جو ۲۰۱۷ء میں سہ ماہی ادبی جریدے "آج" شمارہ نمبر ۱۰۲ میں ایک بار شائع ہوا[۷] اور پھر مکتبہ دانیال کراچی کے توسط سے کتابی شکل میں ۲۰۱۸ء میں سامنے آیا۔ کتاب کی دوسری اشاعت مکتبہ دانیال ہی سے ۲۰۲۰ء میں ہوئی۔ ناول چار درویش اور ایک کچھوا ۲۰۱۸ء میں نواں یو۔بی۔ایل فکشن پرائز برائے اردو ادب حاصل کر چکا ہے مزید بر آں ۲۰۲۰ء میں کراچی لٹریری فیسٹیول انعام کے لیے نامزد بھی ہوا۔ اس ناول نے اپنے منفرد اسلوبِ بیان اور تکنیک کے سبب بہت جلد مقبولیت حاصل کی۔ سید کاشف رضا کی برتی گئی یہی تکنیکیں اور ہیئت کے تجربات ناول کی خاصیت ہیں۔ اس باب میں اس ناول کا جائزہ لیا جائے گا۔ سید کاشف رضا نے اپنے ناول کا انتساب "ابو جی" کے نام کیا ہے۔

۳۳۰ صفحات پر مشتمل یہ ناول ۶ ابواب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ابواب بالترتیب "جاوید اقبال"، "آفتاب اقبال"، "ارشمیدس"، "بالا دی ویجی گاٹ"، "تحصیل دار اقبال محمد خان" کے عنوان سے ہیں جو ناول کے پانچ اہم کردار ہیں۔ جب کہ چھٹا باب "ستائیس دسمبر اور اس کے بعد" کے عنوان سے ہے۔ یہ باب ناول کے پانچوں کرداروں کی کہانیوں کو اختتامی رنگ دیتے ہوئے انھیں آپس میں جوڑتا ہے۔

یہ ناول اپنے منفرد اندازِ بیان، اسلوب، ہیئت کے جدید تجربات اور موضوعات کے اعتبار سے مقبول ہونے والا ناول ہے۔ کئی مبصرین اور ناقدین نے ناول کے متعلق اپنی آرا کا خیال کرتے ہوئے اسے ایک بہترین ادبی متن قرار دیا ہے۔ ۲۰۱۷ء میں ناول پر پہلا تبصرہ "ممنوعات کا ناول چار درویش اور ایک کچھوا" کے عنوان سے خضر حیات نے کیا جس میں انھوں نے ناول کے موضوعات، کرداروں اور مصنف کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے اسے اردو ادب کا ایک بہترین اضافہ قرار دیا ہے۔ خضر حیات کا کہنا ہے کہ سید کاشف رضا کا نام ان کے لیے نیا تھا۔ انھوں نے ناول کی تکنیک کو سراہا کہ کہانیوں کا تانا بانا قاری کو سحر میں جکڑ لیتا ہے اور وہ غیر محسوس طور پر خود کو پلاٹ کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ ناول کے موضوعات ایسے ہیں جنھیں عموماً معاشرے میں ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ یعنی جنس، جنسی رویے، جنس پرستی وغیرہ کو، جنھیں ہمارے ہاں ٹیبو سمجھا جاتا ہے، ناول کا موضوع بنایا گیا۔ جنس کو جنسی عمل سے عمومیت میں دکھانے کی بھرپور سعی کی گئی ہے۔ جنس کے حوالے سے مردوں اور عورتوں کے رویے، ان کی نفسیات کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے مختلف طبقات کے کرداروں کو منفرد انداز میں باقاعدہ مشاہدے کے تحت پیش کیا ہے۔ ناول کے آغاز میں درج ژاں بودریاغ (Jean Baudrllard: 1929-2007)

کے اقوال سے پتا چلتا ہے کہ حقیقت کیا ہے،اس کی تشکیل اور پیش کرنے کے انداز کو آگے زیر بحث لایا جائے گا اور ایسا ہی ہوا ہے۔ناول میں کرداروں کی شخصیات اور نفسیات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔دور حاضر میں ناول کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اس کی تکنیک کے تجربات کو قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث قرار دیا ہے۔[۳]

نومبر ۲۰۱۷ء میں محمد عامر حسینی نے "چار درویش اور ایک کچھوا: کاشف رضا تم شوکت تھانوی نکلو گے، سوچا نہ تھا" کے عنوان سے تبصرہ لکھا۔جس میں ہر باب کے آغاز میں مذکورہ بالا ژاں بادریاغ کے درج فلسفیانہ اقوال سے باب کو تعلق جوڑا ہے۔انھوں نے کاشف رضا کے اسلوب اور تکنیک کو خوب سراہا۔[۴]

مارچ ۲۰۱۹ء میں زبیر فیصل عباسی نے "چار درویش اور ایک کچھوا۔۔۔رنگ برنگ دنیا کی سیر کرواتا ناول" کے عنوان سے تبصرہ کیا۔جس میں انھوں نے ناول کی بیانیہ تکنیک، موضوعات اور کرداروں کی نفسیات پر تبصرہ کیا۔زبیر فیصل عباسی کہانی کی تکنیک کو سراہتے ہیں کہ کاشف رضا کا کہانی کا سرا کبھی راوی، کبھی کسی دوسرے کردار اور کبھی کچھوے کو پکڑا دینے کا منفرد انداز قابلِ تحسین ہے۔یوں انھوں نے کہانی کئی روشوں سے ہمارے سامنے بیان کر دی ہے۔[۵]

بلال حسن بھٹی نے اپریل ۲۰۱۹ء میں "درویشوں کی پول کھولتا کچھوا اور سید کاشف رضا" کے عنوان سے ناول کے موضوعات اور کرداروں پر تبصرہ کیا۔وہ ناول نگار کا ابتدائی تعارف پیش کرتے ہیں۔ ناول کے موضوعات، زبان، منظر نگاری اور کرداروں کو سراہتے ہیں۔[۶]

ظفر اللہ خان نے مئی ۲۰۱۹ء میں "چار درویش اور ایک کچھوا" کے نام سے تبصرہ کیا ہے۔انھوں نے ابتدا میں ناول نگار اور ان کی ادبی خدمات کا تعارف دیا اور ناول کے موضوعات جنس، مذہبی فرقہ واریت، سیاست، سیاسی و سماجی مسائل، دہشت گردی اور عورتوں کے استحصال وغیرہ کی نشان دہی کی ہے۔انھوں نے مضبوط کرداروں کو سراہا ہے اور اسلوب کرداروں، تجربات اور کہانی کے ساتھ انگریزی زبان کے استعمال کو متاثر کن قرار دیا ہے۔[۷]

محمد تیمور نے اگست ۲۰۱۹ء میں ایک کالم لکھا ہے جس میں ناول کے اسلوب اور موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔[۸]

اظہر حسین نے نومبر ۲۰۱۹ء میں "سید کاشف رضا کا کچھوا: ایک لاتنقیدی جائزہ" کے نام سے ایک تنقیدی مضمون لکھا۔جس میں انھوں نے ناول کے کرداروں اور تکنیک پر بحث کی ہے نیز انگریزی متن کے باب کو دلچسپ قرار دیا ہے۔ اظہر حسین نے ناول کی کہانی اور کرداروں کو قابلِ تحسین قرار دیا ہے۔انگریزی متن

والے پارے کو پسند کیا ان کا کہنا ہے کہ جانے کیوں بہت سے لوگوں کو انگریزی والا حصہ نہیں بھایا حالاں کہ انگریزی اور رومن اردو کے امتزاج کے برقی پیغامات دل چسپی کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔[9]

جنوری ۲۰۲۰ء میں "حقیقت کی حقیقت؟" کے نام سے آدم شیر نے ناول کے کرداروں اور جزئیات نگاری پر تبصرہ کیا۔ جس میں کہا کہ ناول کا ابتدائیہ ناول نگار کے نظریۂ فن پر روشنی ڈالتا ہے۔ ناول کے ابواب بیک وقت کل بھی ہیں اور جز بھی۔ انھوں نے تبصرے میں تمام ابواب پر سرسری بحث بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ناول مصنف کے مشاہدے اور معلومات کا منھ بولتا ثبوت ہے اور جزئیات نگاری پر ان کی خاصی گرفت ہے۔[10]

نعیم الرحمن نے نومبر ۲۰۱۸ء میں ایک تبصرہ "جادوئی حقیقت نگاری پر مبنی ناول: چار درویش اور ایک کچھوا" تحریر کیا۔ جس میں لکھا کہ ناول کے لیے برتی گئی نئی تکنیک کاشف رضا کے وسیع مطالعے کی آئینہ دار ہے۔ یوں کہنا بہ حق ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں جادوئی حقیقت نگاری کی مثال پیش کی ہے۔ انھوں نے ناول کی ابواب بندی، بے مثال کردار نگاری، متنازع موضوعات سے بحث کی ہے اور ناول میں خشک فلسفیانہ مضامین کو بھی دل چسپی سے بیان کرتے ہوئے قاری کے علم میں اضافہ کیا ہے۔[11]

۲۰۱۷ء میں عالمی اردو کانفرنس کراچی میں ڈاکٹر آصف فرخی نے بھی اپنے ایک مضمون میں ناول پر تبصرہ پیش کیا تھا جس میں انھوں نے ناول کی ہئیت پر کیے گئے تجربات کو سراہا۔ ان کا کہنا تھا کہ کاشف رضا کے ہئیت کے کیے گئے تجربات ناول میں بیان کی گئی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے الگ الگ زاویے فراہم کرتے ہیں۔[12]

محمد حنیف نے انگریزی زبان میں ایک تبصرہ لکھا جس کا اردو ترجمہ ابو عمش نے "کچھوؤں کا سپنوں بھرا جیون" کے عنوان سے کیا۔ چوں کہ ناول کا ایک اہم موضوع جنس پرستی ہے لہٰذا اپنے تبصرے کے آغاز میں وہ ایک مشہور واہمے کا ذکر کرتے ہیں کہ مرد کا ہر ساتواں سیکنڈ جنسی سوچ میں گزرتا ہے اور سید کاشف رضا اپنے ناول کے ذریعے اس واہمے کو ٹھکانے پر لگاتے سوال اٹھاتے ہیں کہ باقی چھ سیکنڈ میں وہ کیا کر رہے ہوتے ہیں؟ تو باقی کے اوقات میں بھی مرد وہی کچھ سوچتا ہے البتہ وہ ایسا ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ محمد حنیف نے بالترتیب جاوید اقبال، آفتاب اقبال اور پھر اقبال محمد خان کے کرادروں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے تبصرے میں نسوانی کرداروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ محمد حنیف کے مطابق کاشف رضا نے معاشرے کے مردوں کی مریضانہ جنسیت کی تباہ کن تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے ناول کے کرداروں، ناول میں استعمال کی گئی زبانوں کے امتزاج اور مصنف کے مشاہدے کو سراہا ہے۔[13]

فرنود عالم نے ایک تبصرہ "تم نے ایسا کیوں کیا عالم گیر؟" لکھا جس میں کاشف رضا کی تحریر اور ناول کی زبان، ناول میں کی گئی منظر نگاری اور ابواب بندی کی تحسین کی ہے اور ناول میں استعمال ہونے والے متعدد موضوعات کی

نشان دہی کی ہے۔ اس میں بے نظیر کے قتل سے وابستہ دونوں سیاسی سانحات کا بیان بھی ملتا ہے۔ انھوں نے سید کاشف رضا کی نثر کو رواں اسلوب اور مربوط کہانی کی حامل نثر قرار دیا ہے۔[۱۴] موخر الذکر تینوں تبصرے ناول کی دوسری اشاعت کے آخر میں شائع بھی کیے گئے ہیں۔

ناول کی دوسری اشاعت کے سامنے آنے کے بعد ناول کی تقریبِ رونمائی میں ڈاکٹر شمع افروز نے ناول سے متعلق اہم معلومات فراہم کیں۔ انھوں نے ناول کا خلاصہ بیان کیا اور اس کے کرداروں خصوصاً مردانہ کرداروں اور ان کی نفسیات کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا۔ وہ ناول کے موضوعات مذہب، سیاست (سندھ کی سیاست) اور جنسیات کو بھی زیرِ بحث لائیں۔ انھوں نے ناول کی منظر کشی اور مکالمے کے فطری انداز کو بھی سراہا۔ انھوں نے کچھوے کے علامتی کردار کی تخلیق کو خوب سراہا کہ اسی کچھوے والے باب میں تمام کردار کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔[۱۵]

تاہم اس ناول کو جہاں بے شمار پذیرائی ملی وہیں اسے تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ۷ مئی ۲۰۲۰ء کو فیصل اقبال اعوان نے تنقید سے بھرپور ایک طویل تبصرہ "چار درویش اور ایک کچھوا: بدقسمت اردو ناول کے تابوت میں ایک اور کیل" لکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ناول کا اصل مقصد کہانی کہنا ہوتا ہے لیکن کاشف رضا اس فن میں ناکام رہے ہیں۔ تمام ناول خام نثر کا شکار ہے۔ مختصر کہانی کو طوالت دینے کے لیے ناول نگار نے ایک ہی واقعے کا بیان کبھی راوی کے ہاتھوں کروایا، کبھی دوسرے کرداروں اور کبھی کچھوے کے ہاتھوں۔ علمی مباحث ناول کی کہانی پر حاوی آ گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دانش ور ہمیشہ قاری کو تکنیکوں اور تجربات میں الجھا کر کہانی کا اصل مقصد بھول جاتے ہیں۔ ناول کی کہانی، کرداروں، تکنیک پر تنقید کرنے کے ساتھ انھوں نے ناول کے بیانیے کو کمزور اور زبان کو عامیانہ قرار دیا ہے۔[۱۶]

ان تبصروں کے بعد ہم خود ناول کی تفصیل کی طرف جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ناول کے آغاز میں ابتدائیہ درج کیا گیا ہے جس میں راوی کہتا ہے کہ کوئی بھی کہانی ایک رخ سے نہیں دیکھی جا سکتی بلکہ کہانی تو کئی اطراف سے دیکھی جا سکتی ہے اور ہر سمت سے ایک نئی پرت ہمارے سامنے کھلتی ہے۔[۱۷]

ایک ہی کہانی کو کئی راوی بیان کر سکتے ہیں اور ہر ایک کا اپنا نقطۂ نظر ہو گا۔ ناول میں کرداروں کی زندگیوں کے چند مخصوص حصے منتخب کیے گئے ہیں نیز ناول میں استعمال کی جانے والی تکنیک کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ راوی کہانی آپ کے سامنے اور طرح سے پیش کرے گا اور کردار خود کسی اور طرح سے۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ اس کو کیسے دیکھتا ہے۔

چار درویش اور ایک کچھوا کی کہانی کو دیکھا جائے تو یہ ناول کسی مخصوص یا ایسی روایتی کہانی کو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دا" کہلوانے اور ہر وقت کی لعن طعن کے سبب اشتعال انگیز طبیعت رکھتا تھا۔ انتہائی غصیلا، ہٹ دھرم اور جذباتی بالا نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو چکا تھا۔ درج ذیل اقتباس میں بالے کی ذہنی کیفیات کا بیان ملتا ہے:

> وہ چاہتا تھا کہ غصہ اسے اتنی طاقت دے کہ اس کے ایک مکے، یا ایک لات سے اس کا حریف زمین کے دوسرے کنارے سے جا لگے، اس کے ایک تھپڑ سے اس کا منھ پچھلی طرف کو ہو جائے، مگر ہوتا یہ تھا کہ غصے کے ساتھ ہی اس کے دست و بازو شل سے ہو جاتے اور وہ خود کو ہی دوسروں سے پٹتا ہوا پاتا۔ اسے حیرت ہوتی کہ اتنا سارا غصہ جب اس کی لات یا مکے میں جمع ہوتا ہے تو اس کی ضرب پر مضروب کو درد تک کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔[۱۹]

یہ بالے کا ذہنی انتشار ہی تھا کہ وہ بہن کو تنگ کرنے والے رفیق نامی بدمعاش کے قتل کا ارتکاب کرتے ہوئے شہر چھوڑ کر بھاگ گیا اور انتہا پسندوں کی جماعت میں شامل ہو کر بے نظیر جیسی اہم شخصیت کے قتل میں مرکزی کردار ادا کرتا بالا موت کو گلے لگا گیا۔

آفتاب اقبال جو اقبال محمد خان کے بڑے بیٹے تھے یونی ورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ باوقار اور باعزت بیالیس سالہ آفتاب اقبال کو شادی جیسی چیز میں قطعاً دلچسپی نہ تھی۔ جوانی انھوں نے اپنی ماں اور بہنوں کی ذمے داری اٹھاتے گزار دی تھی۔ اب ماں بہنوں کے بار ہا اصرار کیے جانے کے باوجود وہ کنوارے تھے۔ ناول میں فلسفے کا تمام تر دلچسپ اور عام فہم اندازِ بیان آفتاب اقبال کے ذریعے ہم تک پہنچا اور کچھ فلسفیوں جیسے سقراط، افلاطون، ارسطو، سپائی نوزا اور علامہ اقبال سے بھی ہمیں متعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس باب میں پاکستان کے تاریخی اور سیاسی واقعات کا بیان بھی ملتا ہے۔ آفتاب اقبال کی دیدہ زیب اور پُر وقار شخصیت اور رکھ رکھاؤ کے سبب ان کی چھبیس سالہ شاگرد ان پر فریفتہ ہو گئی۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ بھی اسی با حجاب شاگرد اُمِ سلمیٰ کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ اس محبت کی خاطر انھیں اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ ان کی والدہ کا احمدی گروہ سے تعلق سلمیٰ کے خاندان کی ناپسندیدگی کا سبب بنا لہٰذا سلمیٰ کے والد نے آفتاب اقبال کو سلمیٰ سے دور رہنے کا کہا۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> سلمیٰ کے والد نے کہا تھا کہ سلمیٰ کو میرے بارے میں اور میرے فرقے کے بارے میں سب پتا چل گیا ہے اور اب میرے لیے یہی مناسب ترین تھا کہ میں فوری طور پر استعفیٰ دے دوں ورنہ میرے خلاف ہیرس منٹ کی انکوائری شروع کرانے میں انھیں دو منٹ لگیں گے۔[۲۰]

یوں وہ یونی ورسٹی سے مستعفی ہو کر وکالت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سلمیٰ بھی ان کا فرقہ جاننے کے بعد سے ان سے قطع تعلق کیے رہی۔ اس واقعے کے بعد پانچ سال تک دونوں میں رابطہ نہ ہوا۔ بالآخر ایک دن سلمیٰ ہی نے

پیش رفت کی۔ انھیں امِ سلمیٰ کی طرف سے ای۔ میل موصول ہوئی یوں دونوں کا رابطہ بحال ہوا اور دونوں نے عدالت میں جا کر نکاح کر لیا۔ دونوں آسائش بھری زندگیاں چھوڑنے کے باوجود ایک دوسرے کا ساتھ ملنے کے سرور میں روکھی سوکھی کھاتے ہوئے بھی خوش تھے گو کہ اب بھی امِ سلمیٰ کے گھر والے ان کے تعاقب میں تھے۔

جہاں تک چوتھے درویش جاوید اقبال کا تعلق ہے تو وہ اقبال محمد خان کی دوسری بیگم سلطانہ سے تھا جو اپنی رنگین مزاجی اور شوخ طبیعت کے باعث اپنے والد ہی کے جیسا تھا۔ خواتین میں دل چسپی رکھنا اور پھر ان کے ساتھ جنسی مہم تعلق اس کے مزاج کا خاصا تھا۔ جاوید اقبال اپنی والدہ سے علاحدہ ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ اس کی والدہ اس کی تمام تر حرکات و سکنات سے واقف تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ان کا بیٹا اپنے والد کی طرح عورتوں میں دل چسپی لیتا ہے۔ اس کی انتہائی مثال مصنف نے ان کے بچپن کے واقعے کو درج کر کے کی جب وہ سکول میں کسی لڑکی کے ساتھ نازیبا حرکات کرتے پکڑے گئے۔ اسے سرزنش کرنے کے بجائے سلطانہ بیگم نے تفاخر محسوس کیا۔ یہاں بھی ایک چھوٹے سے واقعے کے ذریعے مصنف معاشرے کے اس پہلو کی نشان دہی کی ہے کہ کیسے والدین خصوصاً مائیں بچوں کی غلطیوں پر پردہ ڈال کر انھیں مزید شہ دیتی ہیں۔ جاوید اقبال کا کمرہ اس کے ذہن کا عکاس تھا جہاں دیواروں پر جابجا بھارتی اداکارہ کی مختلف زاویوں سے لی گئیں قد آدم تصاویر آویزاں تھیں۔ وہ بیک وقت اپنی ساتھی ورکر مشعال کے، جو ایک خوب صورت، بااعتماد، نڈر اور کامیاب ٹی وی اینکر بن چکی تھی، عشق میں بھی گرفتار تھا اور پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بھی جنسی تعلقات قائم کیے ہوئے تھا۔ ذیل کا مکالمہ جاوید اقبال کی رومانی اور عاشقانہ مزاج طبیعت کی عکاسی کرتا ہے:

> "آپ پکا بتائیں کہ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا؟" جاوید نے مصافحے کا دورانیہ بڑھانے کے لیے اس سے پوچھا۔
> "نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے بھی خوب سوچ کر جواب دیا۔
> جاوید نے "تھینک یو سو مچ" کہتے ہوئے اپنی بانہیں اس کے کاندھوں پر پھیلا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔
> "کیا کر رہے ہو؟ وہ آتے ہی ہوں گے۔"
> "بس شیک ہینڈ، ہگ وغیرہ تو ٹھیک ہے نا؟"
> "ہاں مگر اس سے زیادہ نہیں۔" [۲۱]

تاہم اپنی جلد باز اور بے صبری عادت کے سبب وہ مشعال کو کھو دیتا ہے۔ جاوید اقبال کے پاس ایک کچھوا 'ارشمیدس' بھی ہے جو ناول کی کہانی میں ایک اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ناول نگار نے کچھوے کو انسانی ضمیر کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کچھوے کو شاید کوئی نہیں دیکھ پاتا مگر وہ سب کرداروں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

آخری باب ناول کے تمام پہلوؤں اور کہانیوں کو منطقی انداز میں جوڑتا ہے۔ یہ تمام کہانیاں باہم ربط بناتی اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ ناول نگار نے کمال مہارت سے ان تمام کرداروں کی کہانیاں بنتے ہوئے ان کے باہمی تعلق کو واضح کیا ہے۔

دیکھا جائے تو یہ ناول اپنے اندر موضوعات کا ایک ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ ناول کی سب سے امتیازی خصوصیت اس کے موضوعات ہیں۔ چھ ابواب پر مشتمل اس ناول میں ہمیں کئی موضوعات نظر آتے ہیں۔ ناول کو خضر حیات اپنے تبصرے میں ممنوعات کا ناول قرار دیتے ہیں[۲۲] یعنی یہ ناول ایسے موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن پر بات کرنا عام طور پر ہمارے معاشرے میں ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ یہ ناول تین بڑے ممنوعہ موضوعات کو لیے ہوئے ہے۔ جنس، سیاست اور مذہب۔ جنس کی بات کی جائے تو اس میں ناآسودہ جنسی عمل یا جنسی ناہمواریاں، جنس پرستی اور جنسی خواہشات، محبت اور جنس، مرد وعورت کے ناجائز تعلقات کا بیان ملے گا۔ سیاست جیسا اہم موضوع بھی ہے جو بے نظیر جیسی اہم شخصیت کے قتل سے متعلق ہے، یوں ملکی سیاست بھی نظر آتی ہے جس کا ایک اہم حصہ مذہبی انتہا پسندی سے جوڑا گیا ہے۔ تیسرے اہم موضوع یعنی مذہب کو لیں تو مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی، عقیدوں کی بالادستی، اقلیتی جماعتوں سے متعلق ہمارے رویے یعنی ہماری آزاد اور خود مختار ریاست میں غیر مسلموں یا اقلیتوں کو درپیش عدم تحفظات اور مذہب کے غلط استعمال کا بیان ملتا ہے۔ ناول نگار نے اقلیتوں کے نفسیاتی کرب اور ذہنی دباؤ کی تصویر کشی کرنے کی بھی معمولی سی کوشش کی ہے جو ذیل کے اقتباس میں نظر آتی ہے:

> میں خود کو مسلمان سمجھتا ہوں، لیکن میرا فرقہ کون سا ہے؟ سلمیٰ کی جانب سے "مولوی ہمارا ہو گا" کے مطالبے نے یہ سوال میرے سامنے ایک بار پھر کھڑا کر دیا تھا۔ اس سوال کے جواب کو ٹالتے ٹالتے میرے پچیس سال گزر چکے ہیں۔ جب ہر مذہب ایکو ئلی گڈ اور بیڈ ہے تو پھر میں مسلمان ہی کیوں نہ رہوں، اپنے ماں باپ کے دین پر؟ لیکن میں کون سا مسلمان ہوں؟ سنی، شعیہ یا احمدی جو مسلمان کا جنازہ نہیں پڑھتے اور جنھیں دوسرے مسلمان کافر قرار دیتے ہیں۔[۲۳]

ناول میں سیاست بھی ہے، مذہب اور فرقہ واریت بھی ہے، جنسیت بھی ہے، فلسفہ بھی ہے، تاریخ بھی ہے، جہالت بھی ہے اور عورت کا استحصال بھی ہے۔ غرض کثیر موضوعات کو اپنے اندر سموئے یہ ناول عہدِ حاضر کے فن پاروں میں ایک اہم اضافہ کہا جاسکتا ہے۔

ناول کسی باقاعدہ پلاٹ کے تحت نہیں لکھا گیا یہی اس ناول کی خوبی ہے۔ ناول نگار نے ناول کو چھ حصوں میں منقسم کرتے ہوئے پہلے پانچ ابواب پانچ مرکزی کرداروں کے نام کر دیے ہیں۔ خود ناول نگار کا ناول سے متعلق کہنا ہے کہ ناول کا کوئی سا باب بھی پکڑ کر ناول شروع کیا جاسکتا ہے۔[۲۴] ناول ایک ہی کہانی پر مشتمل ہونے کے بجائے پانچ

کہانیوں پر مشتمل ہے یعنی ہر باب مخصوص کردار کی کہانی سے متعلق ہے جو بڑے منطقی انداز سے ناول نگار نے آپس میں ملائی ہیں۔ تمام ابواب میں بالترتیب جاوید اقبال، آفتاب اقبال، اقبال محمد خان اور بالے کی کہانیاں ہیں۔ کچھوا یہاں اپنے بجائے تمام کرداروں کی کہانیاں سناتا دکھائی دیتا ہے۔ ناول کا آخری باب تمام کہانیوں کو اختتامی شکل دیتا ہے۔

ناول چار درویش اور ایک کچھوا سے متعلق دوسری اہم چیز اس کے کردار ہیں جو ناول نگار نے معاشرے کے مختلف طبقوں سے تخلیق کیے ہیں۔ پانچوں مرکزی کردار آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ یہ پانچوں مردانہ کردار ہیں۔ مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے یہ کردار ناول میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ کردار جاوید اقبال، آفتاب اقبال، ارشمیدس، اقبال محمد خان اور بالا ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ضمنی کردار امتل، سلطانہ، زرینہ بھابھی، صادق بھائی عرف ککی، مشعال، اُم سلمٰی، عالم گیر، شوکت اور کلثوم بھی شامل ہیں۔ کرداروں کا احوال اقبال محمد خان سے شروع کیا جائے تو پیشے کے اعتبار سے وہ تحصیل دار تھے جو منڈی بہاؤالدین سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے تین بیٹے آفتاب اقبال، جاوید اقبال اور بالا تھے جو تین مختلف خواتین سے تھے۔ یہ سب سے اہم کردار ہے جس کے گرد کہانی کا تانا بانا کافی مہارت سے بُنا گیا ہے۔ اقبال محمد خان طبیعتاً رومانوی اور رنگین مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ جنسی مہم جو بھی تھے۔ عورتوں میں خاص دل چسپی لیتے تھے۔ عورت کی طرف بڑھنا، اس کی پیش رفت پا کر اس سے مراسم قائم کرنا اور جنسی آسودگی حاصل کرنا ان کی فطرت میں بسا تھا۔ پہلی نظر میں امتل جیسی خوب صورت عورت پر فریفتہ ہو کر انھوں نے اس کا اقلیتی مذہبی جماعت سے تعلق نظر انداز کر کے اس سے شادی کر لی مگر امتل کا مذہبی رجحان، پردہ اور پھر محفلوں میں اقبال محمد خان کے ساتھ نہ جانا، وقت اور زمانے کے ساتھ خود کو نہ بدلنا جیسی باتوں نے اقبال محمد خان کی تمام تر توجہ سلطانہ نامی خاتون کی طرف مبذول کروادی۔ سلطانہ جو ایک ماڈرن، شوخ، بولڈ اور زندہ دل خاتون تھی، سے اقبال محمد کی دوسری شادی ہوئی تھی، اپنی رنگین مزاجی کے باعث انھوں نے سلطانہ جیسی باوفا بیوی کو کھو دیا۔ پھر بھی ان کی جنسی سرگرمیوں میں کمی نہ آئی۔ عالم گیر نامی دیہاتی عورت سے جنسی تعلقات کے نتیجے میں ان کا ایک بیٹا بالا پیدا ہوا۔

دوسرا اہم کردار جاوید اقبال ہے۔ جو ایک نیوز رپورٹر ہے۔ جنسی میلانات میں اپنے والد اقبال محمد خان ہی کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ یہ دونوں کردار خاصے بولڈ قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے جنس پرستی دکھائی گئی ہے۔ یہ جنسی بھوک کا مارا ایک ناآسودہ کردار ہے۔ جاوید اقبال ایک جگہ سے جنسی خواہشات پورا ہو جانے کے بعد اکتا جاتا ہے جیسا کہ زرینہ کو اس نے استعمال کر کے چھوڑ دیا اور مشعال کے پیچھے ہو لیا۔ اس کے برعکس اقبال محمد خان ایسے تعلقات کو دیر تک نبھانے کے قائل تھے جیسا کہ عالم گیر کے ساتھ ان کے تادیر مراسم رہے۔

تیسرا اہم کردار آفتاب اقبال کا ہے جو ایک جامعہ میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ باقی دو کرداروں کے مقابلے میں یہ کردار شریف النفس اور اخلاقی طور پر وضع دار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ بیالیس سال کی عمر تک کنوارا رہنے کے بعد وہ اپنی ایک شاگرد کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ ان کا کردار انتہائی مثبت اور حساس انسان کا ہے جو اپنے رشتوں اور مذہبی فرقے کو لے کر انتہائی حساس دکھائی دیتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ آفتاب اقبال منطقی آدمی ہے۔

چوتھا اہم کردار کچھوے کا ہے۔ کراچی میں صدر کے علاقے رتن تلاؤ کے نام سے ایک آبادی ہے جہاں دو مندر ہیں۔ ایک "رام چندر ٹیمپل" اور دوسرا آبادی کے اندر ہے۔ یہ ایک عجیب مندر ہے۔ جاوید اقبال نے اسی مندر سے کچھوا لا کر اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے جس کا نام 'ارشمیدس' ہے۔ کچھوا ایک علامتی کردار ہے جس کے ذریعے مصنف نے انسانی ضمیر کی پیش کش کی ہے۔ جو کوئی نہیں جانتا وہ کچھوا جانتا ہے۔ کچھوا کہیں نہ موجود ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ وہ تمام کرداروں کی کہانیوں سے باخبر ہے۔ خضر حیات نے اپنے تبصرے میں کچھوے کو ہم زاد کہا ہے جو یقیناً بجا ہے کیوں کہ جو بات انسان کسی دوسرے انسان سے بیان نہیں کر سکتا وہ ہم زاد سے کر سکتا ہے۔ کچھوا راوی سے زیادہ جاننے کا دعوے دار ہے۔ ناول میں حقیقت کی کئی پرتیں اس کرادر کے ذریعے کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ اگر ہم کچھوے والا باب ناول کے مطالعے کے دوران نظر انداز بھی کر دیں تو ناول کے فہم میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔ لیکن در حقیقت اس کردار نے ناول کے بیانیے کو ایک نئی سمت عطا کی ہے۔

پانچواں مرکزی کردار منڈی بہاؤالدین کے ایک نچلے گھرانے میں پیدا ہونے والے محمد اقبال عرف بالے کا ہے۔ جو گاؤں بھر میں "بالا حرام دا" کے نام سے مشہور ہے۔ بالا اقبال محمد خان کی عالم گیر سے پیدا ہونے والی ناجائز اولاد ہے۔ ہر وقت کی گالم گلوچ اور حرامی کہے جانے پر باغی اور غصیلا بالا اپنے جذبات پر قابو رکھنا نہیں جانتا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی بہن کو ستانے والے محمد رفیق کے قتل کا ارتکاب کر کے گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ بے نظیر جیسی اہم شخصیت کے قتل میں بالا مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

ان پانچ مرکزی کرداروں کے علاوہ بھی ناول میں دوسرے کردار ہیں۔ صادق بھائی عرف کُکی سیدھا سادہ اور بے ضرر انسان ہیں جنھیں الہامی خواب آتے ہیں۔ وہ اپنے ارد گرد نظر آنے والے حقائق سے باخبر ہوتے ہیں اور اس کے سبب ہر وقت بے چین رہتے ہیں۔ یہی بے چینی اور اضطراب انھیں اولیا کرام کے مزاروں سے جوڑے رکھتے ہیں۔ صادق بھائی کا کردار بھی ایک علامتی کردار ہے جو معاشرے میں سماجی اور سیاسی افکار کا عکاس ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں بیل سوار نوجوان، شوکت، ملا عمر اور قاری حسین کے مردانہ کردار نظر آتے ہیں۔

نسوانی کرادروں کا ذکر کیا جائے تو زرینہ بھابھی، ام سلمیٰ، امتل، سلطانہ آنٹی، مشعال، عالم گیر، کلثوم شامل ہیں۔ زرینہ اور عالم گیر، ایک شہر سے دوسری دیہات سے تعلق رکھنے والی خواتین کا کردار ایک جیسا ہی ہے۔ دونوں

اپنی ازدواجی زندگیوں میں غیر مطمئن ہیں اور جاوید اور اقبال محمد خان کے ساتھ جنسی میلانات قائم کرتی ہیں۔ اسی طرح سلطانہ اور مشعال ناول کے سب سے بااعتماد اور زندہ کردار ہیں۔ مشعال بہت کچھ کر جانے، آگے بڑھنے کا جذبہ رکھنے والی اور انقلاب کا پرچار کرنے والی خاتون ہے۔ سلطانہ بیگم زندہ دل خاتون ہیں۔ ادب و سیاست ہو، محفل آرائی ہو یا کوئی بحث و مباحثہ ہر چیز میں وہ اقبال محمد خان کی ہم خیال ثابت ہوتی ہیں۔ سلطانہ بیگم جیسی باوفا عورت اقبال محمد خان کی ہر جگہ منھ مارنے والی عادت کے سبب انھیں چھوڑ جاتی ہیں۔ وہ انھیں بے وفا گردانتی ہیں۔ امتل مذہبی رجحان رکھنے والی سادہ لوح خاتون ہیں۔ ان کے خیالات و جذبات کسی بھی طرح اقبال محمد خان کے مماثل نہیں۔ اسی وجہ سے ان کے حسن پر فریفتہ ہونے کے باوجود ان دونوں کی نہ نبھ سکی۔

اس ناول کے تمام کردار پختہ شخصیات کے حامل ہیں۔ ہر کردار بھرپور نفسیات رکھتا ہے۔

منظر نگاری کسی بھی فن پارے میں ایک موثر تکنیک گردانی جاتی ہے جس کی مدد سے واقعات و سانحات ذہنی تصویر بن کر سامنے آتے ہیں۔ یہ تکنیک کاشف رضا نے خوب چابک دستی سے نبھائی۔ بیڈ روم ہو، سیاسی منظر ہو، کسی جلسے کا احوال، یا کسی دیہات کی عکاسی کرنی ہو تمام چیزوں کو سید کاشف رضا نے جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ذیل میں کچھ مناظر کی تصویر کشی کی امثال دی گئی ہیں۔

> دروازہ کھولتے ہی آپ کا سامنا کرینہ کپور کی ایک بڑی تصویر سے ہوتا ہے۔ پینافلیکس پر بنی سات فٹ کی اس تصویر میں کرینہ کپور پورے قد سے کھڑی نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ اس کی ٹانگوں کے درمیان ایسے بندھے ہیں کہ ان دو انگوٹھوں اور دو ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں کے درمیان ایک ہارٹ کی شکل بن گئی ہے اور اس ہارٹ کے درمیان اس کے شارٹس کا نیلا رنگ گہرا ہو گیا ہے۔ شارٹس کے نیچے اس کی برہنہ ٹانگیں ہیں اور پیروں میں لمبی ہیل والے سینڈل۔ اس کے چہرے پر مستی ہے اور اس کی آنکھیں آپ کو ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے وہ کوئی چیلنج کر رہی ہو۔ ہو سکتا ہے اپنے قد سے بڑی دکھنے والی لڑکی کا یہ چیلنج آپ کو اپنی مردانگی آزمانے پر اکسائے۔[۲۵]

درج بالا اقتباس جاوید اقبال کے گھر کی منظر کشی کر رہا ہے۔ آگے ڈرائنگ روم، سونے کے کمرے کا بھی تفصیل سے بیان ہے لیکن چوں کہ اقتباس طوالت اختیار کر جائے گا لہٰذا یہاں ایک مختصر ٹکڑے سے مدد لی گئی ہے جو جاوید اقبال کے فلیٹ میں داخلے کو پوری جزئیات کے ساتھ ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ اب دیہات کے ایک گھر کا منظر ملاحظہ کیجیے:

> گھر کے اندر داخل ہوں تو پیشاب کی تیز بو آپ کے نتھنوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس کی قصوروار ایک بکری ہے جو گھر کے اندر دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ بندھی ہے۔ بکری کے ارد گرد اس کے پیشاب کے ساتھ ساتھ اس کی مینگنیاں بھی بکھری ہوئی ہیں اور وہاں کی غنودہ کر

دینے والی بُو میں اونگھ رہی ہے۔ سامنے کے رُخ پر دو کمرے ہیں۔ گھر کے سات افراد انھیں دو کمروں اور سامنے کے چھوٹے سے صحن میں گزارہ کرتے ہیں۔ کمروں کے دائیں ہاتھ پر ایک غسل خانہ اور ایک بیت الخلا ہے، جس کے قریب سے گزرتے ہوئے بُو کا بھبھاکا آپ کا استقبال کرتا ہے۔ ان دونوں کے عین سامنے ایک باورچی خانہ ہے جس کے ایک طرف دیوار اور دوسری طرف کمرا ہے جب کہ باقی دو طرف سے وہ کھلا ہوا ہے۔[۲۶]

ناول کے مکالمات دیکھیں تو خواہ وہ اکیسویں صدی کی عکاسی کرتے نوجوان عاشق کے ہوں؛ متوسط طبقے کی روزمرہ بول چال ہو یا اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی شخصیت کی سیاسی گفت گو، شدت پسندوں کی جماعت ہو یا کمرۂ جماعت میں طلبا کا مباحثہ، ان میں زبان اور لہجے کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ناول نگار متعدد زبانوں اور بدلتے لہجوں کو کمال مہارت سے سمیٹے ہوئے ہیں۔ استاد کی زبان، دیہات کے منچلوں کی زبان، دیہی عورت کی زبان، نیوز رپورٹر کی زبان، سیاسی زبان، انتہا پسندوں کی زبان غرض ہر کردار بہترین لب و لہجے کا استعمال رکھتا ہے اور کرداروں کا لب ولہجہ اور ان کا اتار چڑھاؤ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اردو کے علاوہ انگریزی، پنجابی، پوٹھوہاری اور پشتو زبانوں کا استعمال برمحل ملتا ہے، زبانوں اور علاقہ جات کے مطابق بدلتے لہجے ناول کی زبان کو چار چاند لگاتے ہیں۔ ناول کا تقریباً ایک پورا باب انگریزی میں ہے لیکن یہ کہنا لازم ہے کہ جس طرح احساسات کی ترجمانی انگریزی زبان میں ہوئی ہے شاید اردو زبان میں نہ ہو پاتی۔ اس باب میں اقتباسات بھی انگریزی میں ملیں گے اور مکالمے بھی۔ اسی طرح رومن اردو میں کیے جانے والے برقی پیغامات بھی قاری کی دل چسپی بڑھاتے ہیں۔ انگریزی اور رومن اردو کے مکالمے جاوید اقبال اور مشعال کے مکالمات میں نظر آتے ہیں۔ ذیل میں مثال کے طور پر کچھ جملے دیے گئے ہیں۔ مثلاً انگریزی مکالمے دیکھیے:

- I am listening
- Actually

  I want to marry you
- Hahahahahhhahahahahahah

  Hahahahahhahahahh

  Are you serious??[۲۷]

اس کے علاوہ جابجا بے شمار انگریزی ٹکڑے ملتے ہیں۔

Why you had to do this Umm e Salma?[۲۸]

I think we'll make a good pair.[۲۹]

It was always interesting being led away by a women of charms.[۳۰]

تیسرے باب میں کچھوے کی آرا سے متعلق تمام طویل اقتباسات انگریزی میں ہیں۔ ان میں سے پہلے اقتباس کا ابتدائی ٹکڑا ذیل میں دیا گیا ہے۔

> Well... well...well.. enough of you Mr. Aftab Iqbal and Mr. Javed Iqbal. And Mr. Ravi, you can only be a drenched river. You can only rot along our cultural capital. Enough of you for the time being at least. You can get hold of your stories but you can't go very far with that. I will get hold of you again like my balls.
>
> Lo and behold!................. upside down.[۳۱]

جب کہ مشعال اور جاوید اقبال کے برقی پیغامات جو رومن اردو پر مشتمل ہیں، کچھ یوں ہیں:

> Javed: Acha main tumhen call karta hun
>
> Mishal: Nahi don't call
>
> Mama jag jayen gi
>
> Javed: Why are you laughing?
>
> Mishal: Tum ne baat hi itnay mazay ki ki hai.[۳۲]

ناول میں بیش تر اردو مکالمے ہمیں ایسے بھی ملیں گے جن میں اردو کے ساتھ انگریزی کا امتزاج ہے اور انگریزی بھی اردو حروفِ تہجی میں تحریر کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر:

آپ کی بھی **لو میرج** ہو گی۔[۳۳]

دیکھو! **آئی ایم گوئنگ مائی وے**۔[۳۴]

اور؟ اس کے علاوہ؟ **واٹ ایلس**؟[۳۵]

اس ناول میں انگریزی کے اقتباسات اور مکالمے ہی شامل نہیں بلکہ مصنف نے انگریزی شاعری کے ٹکڑے بھی استعمال کیے ہیں جو صورت حال کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً ولیم ورڈز ورتھ کی انگریزی نظم "To the Cuckoo" کی ابتدائی لائنوں کو بھی پیش کیا گیا ہے جو ذیل میں دی گئی ہیں:

> O blithe new-comer! I have heard,
> I hear thee and rejoice.
> O cuckoo! Shall I call thee bird,

Or but a wandering voice?[۳۶]

ناول میں استعمال کی جانے والی دوسری نمایاں زبان پنجابی ہے۔ ذیل میں اس کے بھی کچھ ٹکڑے مع ترجمہ دیے گئے ہیں:

"توں وی مر جاندی ناں اوس آپنے یار دے نال!"[۳۷]

(تم بھی اپنے اس یار کے ساتھ مر جاتی نا!)

"وے یار ہوسن تیریاں بھیناں دے۔ یار ہوسی تیری ماؤدا۔"[۳۸]

(یار ہوں گے تمھاری بہنوں کے۔ یار ہوں گے تمھاری ماں کے)

"ایہہ کھالے۔ تے کسے نوں ناں دسیں۔"[۳۹]

(یہ کھالو اور کسی کو نہ بتانا)

پوٹھوہاری زبان کا استعمال بھی ایک جگہ پر کیا گیا ہے۔

"اوہ بابا جی اس کی کرن تے دیو کج او۔"[۴۰]

(اوہ بابا جی اسے کچھ کرنے تو دیں۔)

"میکی تے ایہہ پاگل لگنا!"[۴۱]

(مجھے تو یہ پاگل لگتا ہے۔)

"اساں کی سردائی پیائی اے۔ سرے تے نئیں چڑھ گئی؟[۴۲]

(ہم نے اسے سردائی پلائی ہے۔ کہیں سر تو نہیں چڑھ گئی۔)

ناول میں انتہا پسندوں کا جہاں ذکر کیا گیا ہے وہاں پشتو زبان کے بھی چند جملے ناول نگار نے ڈال دیے ہیں۔

"داٹولو مجاہدین دے۔"[۴۳]

(یہ سب مجاہدین ہیں۔)

جہاد فرض دے۔ اوخونئے انتقام زمنگاپارا قرض دے۔"[۴۴]

(جہاد فرض ہے اور ان کا انتقام ہم پر قرض ہے۔)

اسی طرح سے ناول نگار نے مختلف زبانوں کے لہجوں کو بھی مکالمات کے ذریعے ہی پیش کیا ہے۔ گو کہ ہم انھیں سن نہیں رہے مگر اندازِ بیان ان کے لب و لہجے کی وضاحت کرتا ہے۔ جیسے اردو میں پنجابی کی ملاوٹ عالم گیریوں کرتی ہے:

"جی شوکت لہایا تھا۔"[۴۵]

"صاحب جی، بوا کھلا ہے۔"[۴۶]

بالا اردو پنجابی کا استعمال یوں کرتا ہے:

"تو فیر میں کیا کروں؟"[۴۷]

"بے نظیر بہت کمینا ہے۔"[۴۸]

"---سنا ہے کچ دنوں میں وہ کراچے آنے والا ہے۔ وہ ایک بار آ جائے، پر دیکو ام اس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔"[۴۹]

یوں نواز شریف کو نواش شریپ، مشرف کو مشرپ۔ چھوٹا کو چوٹا۔ پوچھے کو پوچے کہنا سب پشتو لہجے میں اردو زبان بولنے کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ یہ تمام پشتو لہجے اور اردو پنجابی کے امتزاج والے الفاظ[۵۰] کو اوپر کی مثالوں میں خط کشیدہ کیا گیا ہے۔

ان مختلف زبانوں کے امتزاج نے ناول کی زبان کو دل چسپ بنانے کے ساتھ ساتھ اسے انفرادیت بخشی ہے۔ یہ ناول دیگر کئی معلومات کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے جو ہمیں ناول نگار کے وسیع علم اور معلومات کا پتا دیتا ہے۔ ناول میں ہمیں سیاست دانوں اور سیاسی واقعات کا بیان بھی ملتا ہے مثلاً بے نظیر بھٹو کے قتل کا واقعہ، احمد شاہ ابدالی کی مرہٹوں کو شکست، اورنگ زیب کا عہدِ حکومت، میر جعفر، سراج الدولہ، نواز شریف، مشرف، نہرو اور سلمان تاثیر۔ اس سے ہمیں انگریزی فلموں اور کرداروں کی بھی کافی معلومات ملتی ہیں۔ جیسے پہلے باب میں ہندی فلم "چنبیلی" اور "کرینہ کپور" کا ذکر ملتا ہے۔[۵۱] دوسرے باب میں انگریزی فلم "Pulp Fiction" کی کہانی کے خلاصے کے ساتھ فلم کے کرداروں جان ٹریولٹا اور بروس ولس کا ذکر بھی ملتا ہے۔[۵۲] اقبال محمد خان والے باب میں انگریزی فلم "ہش" کے ایک منظر کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور فلم کی مرکزی کردار "گوینتھ پالٹرو" کا ذکر کیا گیا ہے۔[۵۳] اس کے علاوہ اسی باب میں انگریزی فلم "کلیو پیٹرا" اور "ٹرسٹانا" کی کہانیوں کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے اور ان فلموں کے تانیثی کرداروں میں، "الزبتھ ٹیلر" اور "کیتھرین ڈنئیو" نیز "بلائیڈ ڈینز" کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اقبال محمد خان کے ذریعے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ فلم "کلیو پیٹرا" میں الزبتھ ٹیلر کے بجائے صوفیہ لورین کو کلیو پیٹر کا کردار کرنا چاہیے تھا۔[۵۴]

انگریزی ڈراما نگار شکسپئیر[۵۵]، پرتگالی ادیب پیسو آ کی تخلیقات اور اس کی شخصیت[۵۶] کا ذکر بھی ملتا ہے۔ انگریزی شاعر ولیم ورڈز ورتھ کی نظم "To the Cuckoo"[۵۷] اور مشرقی شاعر فیض کی شاعری،[۵۸] علامہ اقبال

کے شعر[۵۹] موسیقار مہدی حسن کی غزل[۶۰] کا بیان بھی ملتا ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول بین المتونیت کے لحاظ سے بھی اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔

ناول چار درویش اور ایک کچھوا کا ایک کردار یعنی آفتاب اقبال چوں کہ فلسفے کا استاد ہے اس لیے ناول میں ہمیں چند مشہور مغربی فلسفیوں اور ان کے فلسفوں سے متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے جیسا کہ ہر باب کے آغاز میں ژاں بودریاغ کا کوئی نہ کوئی فلسفہ درج ہے۔ اسی طرح ڈیکارٹ کے ذیل میں دیے گئے فلسفے پر بھی تفصیلاً بحث کی گئی ہے:

"میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں۔"[۶۱]

دوسرے باب میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ "ممیسس"(Mimesis)[۶۲] پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔[۶۳] اس فلسفے کی وضاحت میں ہمیں مزید فلسفوں سے بھی استفادے کا موقع ملا ہے جیسا کہ سقراط کا فلسفہ جو ذیل میں دیا گیا ہے:

"فن کار نقل کی نقل تیار کرتا ہے اور حقیقت سے یا سچائی سے دو درجے دور ہوتا ہے۔"[۶۴]

اسی نظریے کو افلاطون نے بھی بیان کیا ہے۔[۶۵] اور ارسطو نے بھی یوں بیان کیا ہے:

> ممیسس حقیقت کی صرف امی ٹیشن یا نقالی نہیں ہے۔ بلکہ آرٹ میں حقیقت کی نقل بھی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حقیقت کو ایک توازن بھی دینے کی کوشش ہوتی ہے، جس سے حقیقت ایک چھوٹی لیکن متوازن شکل میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اسی کو آرٹ یا اچھا آرٹ کہتے ہیں۔[۶۶]

اسی طرح "ممیسس" ہی کے تصور پر مبنی یونانی فلسفی ڈایونیسئس کا نظریہ بھی پیش کیا گیا ہے جس نے اپنے نظریے کو "اِمی ٹیشو" کا نام دیا ہے۔ جس کے مطابق "ادب پہلے سے موجود فن پاروں کو موجودہ زمانے سے ہم آہنگ کر کے انھیں نئی شکل دینے کا نام ہے۔"[۶۷]

آفتاب اقبال والے باب میں یہودی فلسفی بروچ سپائی نوزا کے اپنے مسیحی استاد کی لڑکی سے محبت کے واقعے کو آفتاب اقبال جو احمدی ہے اور سلمیٰ جو مسلمان ہے، سے مماثل قرار دیا ہے کہ ان دونوں کو ہی محبت کے جرم کے پاداش اپنے روزگار سے محروم ہونا پڑا۔[۶۸] اس کے علاوہ اسی باب میں مشرقی فلسفی علامہ محمد اقبال کے تصورِ خودی اور تصورِ حقیقت کو بھی تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔[۶۹]

ناول میں تاریخی واقعات جیسے کہ سکندرِ اعظم [۷](۳۲۳ تا ۳۵۶ قبل مسیح) کی فتوحات اور دریافتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور دریائے جہلم کے کنارے واقع متعدد علاقوں مثلاً پھالیہ، نکائیا اور ہیلاں سے متعلق معلومات بھی ملتی ہیں۔ مزید برآں اس میں مغربی تاریخ دانوں آریان، جسٹن اور ڈایوڈورس کا بھی سرسری ذکر کیا گیا ہے۔

اس ناول میں مغربی ناول نگار میلان کنڈیرا کے ناول لافانیت [۱]اور خورخے لوئیس بورخیس کے ناول The Novel of Forking Paths [۲]کی کہانی کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

درج بالا تمام تر بحث کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول چار درویش اور ایک کچھوا سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ نئی تکنیکیں، ہیئت کے تجربات، متنوع موضوعات، منفرد زبان اور مضبوط کردار ناول کے امتیازی اوصاف ہیں۔ لسانی تجربات کے حامل اس ناول نے برمحل متعدد زبانوں کے استعمال سے اس فن پارے کو انفرادیت عطا کی ہے۔ نیوز بلیٹن سے پس ماندہ دیہات تک کی زبان شستہ انداز میں قاری تک پہنچتی ہے۔ ناول کو زبانوں کے رنگا رنگ استعمال کی بدولت خوب سراہا گیا ہے لیکن چوں کہ اب تک اس لحاظ سے ناول کو سمجھنے کی کوئی علمی کاوش سامنے نہیں آئی لہٰذا مقالے میں ناول کا جائزہ تحولِ زبان (Code Switching) کے حوالے سے کیا جائے گا جس کے لیے ناول کے اگلے دو ابواب مختص کیے گئے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ مصنف خود اپنے سفر ناموں کو "سفری کہانیاں" کہتے ہیں۔ یہ معلومات مصنف نے خود مہیا کی ہیں۔
سید کاشف رضا، مقالہ نگار سے ٹیلی فونی گفت گو، بتاریخ: ۱۷ اپریل ۲۰۲۲ء، بروز اتوار۔

۲۔ ناول کی اشاعت سے متعلق یہ معلومات مصنف سے براہِ راست لی ہیں۔
سید کاشف رضا، ایضاً۔

۳۔ خضر حیات، "ممنوعات کا ناول: چار درویش اور ایک کچھوا، از سید کاشف رضا"، تاریخ ملاحظہ: ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ء،
http://www.aikrozan.com/syed-kashif-raza-first-novel

۴۔ محمد عامر حسینی، "چار درویش اور کچھوا: کاشف رضا تم شوکت تھانوی نکلو گے، سوچا نہ تھا"، تاریخ ملاحظہ ۲۱ اگست ۲۰۲۱ء۔
a7%d8%b1- https://jagarti.wordpress.com/2017/11/13/%da%86%d8%
%d8%af%d8%b1%d9%88%db%8c%d8%b4-%d8%a7%d9%88%d8%b1-
%da%a9%da%86%da%be%d9%88%d8%a7-%da%a9%d8%a7%d8%b4%d9%81-
%d8%b1%d8%b6%d8%a7-%d8%aa%d9%85-%d8%b4%d9%88%da%a9%d8%aa-
%d8%aa%da%be

۵۔ زبیر فیصل عباسی، "چار درویش اور ایک کچھوا ...رنگ برنگی دنیا کی سیر کرواتا ناول"، تاریخ ملاحظہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ء،
https://urdu.nayadaur.tv/11311/

۶۔ بلال حسن بھٹی، "درویشوں کی پول کھولتا کچھوا اور سید کاشف رضا"، تاریخ ملاحظہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ء،
https://urdu.arynews.tv/review-by-bilal-hassan-bhatti-on-syed-kashif-raza-novel/

۷۔ ظفر اللہ خان، "چار درویش اور ایک کچھوا"، تاریخ ملاحظہ ۲۱ اگست ۲۰۲۱ء،

168/ https://www.humsub.com.pk/237712/zafarullah-khan-

۸۔ محمد تیمور، "چار درویش اور ایک کچھوا"، تاریخ ملاحظہ ۱۲اکتوبر ۲۰۲۰ء،
https://daanish.pk/37177

۹۔ اظہر حسین، "سید کاشف رضا کا کچھوا: ایک لاتنقیدی تجزیہ"، تاریخ ملاحظہ ۱۲اکتوبر ۲۰۲۰ء،
https://www.humsub.com.pk/284478/azhar-hussain-11/

۱۰۔ آدم شیر، "حقیقت کی حقیقت؟(چار درویش اور ایک کچھوا پر تبصرہ)"، تاریخ ملاحظہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ء،
http://www.mukaalma.com/89364

۱۱۔ نعیم الرحمان، "جادوئی حقیقت نگاری پر مبنی اردو ناول : چار درویش اور ایک کچھوا"، تاریخ ملاحظہ ۲۱ اگست ۲۰۲۱ء،
https://daanish.pk/30231

۱۲۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا(کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۲۰ء)،ص ۳۳۳۔

۱۳۔ ایضاً،ص ۳۳۷۔

۱۴۔ ایضاً،ص ۳۴۵۔

۱۵۔ https://fb.watch/bfe2YC0nMR/

۱۶۔ فیصل اقبال اعوان، "چار درویش اور کچھوا :بدقسمت اردو ناول کے تابوت میں ایک اور کیل"، تاریخ ملاحظہ ۲۱ اگست ۲۰۲۱ء،
https://www.humsub.com.pk/316915/faisal-iqbal-awan-19/

۱۷۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا،ص ۱۱۔

۱۸۔ ایضاً۔ص ۲۴۷۔

۱۹۔ ایضاً۔ص ۱۹۶۔

۲۰۔ ایضاً۔ص ۱۳۴۔۱۳۵۔

۲۱۔ ایضاً۔ص ۶۳۔

۲۲۔ خضر حیات، "ممنوعات کا ناول :چار درویش اور ایک کچھوا، از سید کاشف رضا"،ص۔

۲۳۔ ایضاً،ص ۲۷۴۔۲۷۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۸۔۳۹۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۵۰۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۷۷۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔۱۶۲۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۰۷۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۰۵۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۲۷۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۴۲۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۳۲۰۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۲۰۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۲۰۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۱۲۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۱۲۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۴۰۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۲۴۱۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۲۰۹۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۱۳۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۱۳۔

۵۰۔ جدول:

فیر (پنجابی)	پھر
بوا (پنجابی)	دروازہ
لہایا (پنجابی)	لے کر آیا
کمینا (پشتو تانیث)	کمینی
کچ	کچھ
کراچے	کراچی
پر دیکو اَم	پھر دیکھو ہم
نواش شریپ	نواز شریف
مشرپ	مشرف
پُوچے	پوچھے

۵۱۔ ایضاً۔ ص ۵۶۔

۵۲۔ ایضاً۔ ص ۱۴۶۔۱۴۷۔

۵۳۔ ایضاً۔ ص ۲۷۷۔

۵۴۔ ایضاً۔ ص ۲۵۹۔۲۶۰۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۵۹۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۳۲۷۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۲۵۹۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۶۱۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔

۶۲۔ کسی بھی تحریر میں حقیقت کی نمائندگی یا ریپری زنٹیشن ممیسس کہلاتی ہے۔

۶۳۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۹۵۔

۶۴۔ ایضاً۔ ص ۹۶۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۹۶۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۹۶۔

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۷۲۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۶۹۔ سکندرِ اعظم مقدونیہ کی سلطنت کا بادشاہ تھا۔ وہ صرف بیس سال کی عمر میں بادشاہ بنا اور بارہ سال تک اقتدار سنبھالا۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۰۷۔۱۰۸۔

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۳۷۔

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔

باب سوم:

چار درویش اور ایک کچھوا میں تحولِ زبان کی نوعیت و مظاہر

باب سوم:

چار درویش اور ایک کچھوا میں تحولِ زبان کی نوعیت و مظاہر

پیٹر اوور (Peter Auer :1954) کا کہنا ہے کہ وہ سطح جہاں تحولِ زبان ہو رہا ہو یعنی جملے کا وہ حصہ جہاں زبان میں تبدیلی واقع ہو رہی ہو گفت گو کا ایک اہم پہلو ہے۔ اگلی سطح وہ ہے جہاں زبانوں کا اختلاط ہوتا ہے۔ یہ انفرادی تبدیلی نہیں ہے جو اہمیت رکھتی ہے بلکہ مجموعی تبدیلی کے طور[1] (mode) کا استعمال ہے۔ تیسرا مرحلہ مربوط lects یعنی مخلوط اقسام ہیں۔ اوور تحولِ زبان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> شرکا کی جانب سے مقامی طور پر سمجھی اور تشریح کی جانے والی معنی خیز زبانوں کا تناسب تحولِ زبان کہلاتا ہے۔[2]

تعریف کی رو سے گفت گو کا اہم حصہ وہ ہے جہاں زبانوں میں تبدیلی رونما ہو رہی ہو یعنی زبانوں کا اختلاط ہو رہا ہو۔ اس تعریف کا اطلاق ہم ناول پر کریں تو ہمیں تقریباً ہر مکالمے میں ایسی صورت حال نظر آتی ہے جہاں متکلم دو زبانوں کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً:

> **سوری** میں نے آپ کو **ہرٹ** کیا۔[3]
>
> اس کا مطلب یہ ہے کہ میری **لومیرج** ہو گی۔[4]
>
> میں **رومانٹک** بھی نہیں۔ **برڈیز**، **ویلنٹائن**، **گفٹس**، **آؤٹنگز**، کسی بھی چیز کا کچھ پتا نہیں مجھے۔[5]

درج بالا مثالوں میں اردو اور انگریزی کے اختلاط کی نشان دہی کی گئی ہے۔ لیکن اگر ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی دیکھنی ہو تو ذیل میں امثال دی گئی ہیں:

> بلیو می۔ میں ایسا بالکل نہیں ہوں جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔[6]
>
> دیٹ مے بی آ گڈ تھنگ، بٹ آئی ایم ناٹ میڈ فور دیٹ۔ ہم میں سے ہر ایک کو انفرادی طور پر یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنی انرجی کو کیا پوزیٹیو سمت دے سکتا ہے۔[7]

مختلف زبانوں کا یہ تناسب تارکینِ وطن برادریوں، علاقائی اقلیتوں اور مقامی کثیر اللسانی گروہوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ ذو لسانی لوگ ایک ہی گفت گو یا جملے میں کئی زبانوں یا بولیوں کا استعمال کرتے ہیں جو ہمیں مختلف صورتوں میں ملتی ہیں۔ کبھی گفت گو کے دوران مخاطب کے ساتھ دو زبانوں کا استعمال شروع کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہمیں فقرے کی حد تک بھی ملتا ہے اور جملے کی صورت میں بھی۔ بعض اوقات یہ یک لفظی بھی ہوتا ہے جیسا کہ ناول میں سوری، یس، اوکے، فورٹی ٹو، پوائزن، اچاو غیرہ کے الفاظ یک لفظی منتقلی کی عام مثال ہیں۔

اس لیے آسانی کے پیشِ نظر مختلف ماہرینِ لسانیات کے ہاں تحولِ زبان کی تین اہم اقسام ملتی ہیں مثلاً کیرول مائرس اسکاٹن (Carol Myers Scotton:1934) بھی رومینی سوزین کی طرح تحولِ زبان کی تین اقسام بتاتی ہیں۔

- ✓ دروں جملوی تحولِ زبان (Intra Sentential Code Switching)
- ✓ بین الجملوی تحولِ زبان (Inter Sentential Code Switching)
- ✓ ٹیگ تحولِ زبان (Tag Code Switching)[۸]

دروں جملوی تحولِ زبان میں جملے یا فقرے کے اندر ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی اختیار کر لی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر:

دیکھو! یہ **کینال** دیکھ رہے ہو؟[۹]

تو **فیر** میں کیا کروں۔[۱۰]

سارا **گراں** کہتا تھا کہ جوانی تو عالم گیر پر آئی ہے۔[۱۱]

اس کے **مامے کی دھی** کا وہاں کسی کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔[۱۲]

ابھی تم **پوچے** گا کہ اپنی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں کیسے دے **دیو**۔[۱۳]

درج بالا مثالوں میں ہم نے جملوں کی حدود میں انگریزی، پنجابی اور پشتو کا استعمال دیکھا کہ متکلم نے کس طرح سے دوسری زبان کے چھوٹے چھوٹے الفاظ گفت گو میں شامل کیے ہیں۔ ان امثال میں "کینال" انگریزی، "فیر"، "گراں" اور "دھی" پنجابی کے الفاظ ہیں جب کہ "پوچے" اور "دیو" پشتو زبان بولنے والے متکلم کا لہجہ ہے۔ بین الجملوی تحولِ زبان میں جملے یا فقرے کے باہر دوسری زبان کا استعمال کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل امثال ملاحظہ کیجیے:

ہاں! **از اٹ آ بگ ڈیل**؟ وہ میرے انکل کی عمر کے ہیں فار گاڈز سیک![۱۴]

وہ کہتے نہیں ہیں کہ **دے لوڈ ہیپیلی ایور آفٹر**؟[۱۵]

بٹ آئی نو کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔[۱۶]

درج بالا امثال میں جملے کی حدود سے باہر دوسری زبان کا استعمال مشاہدہ کیا گیا ہے۔

ٹیگ تحولِ زبان میں جملے یا فقرے کے آغاز یا اختتام پر دوسری زبان کے ٹکڑے کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں کچھ امثال دی گئی ہیں:

ڈھائی ہزار سال سے اس پر بحث کیوں ہو رہی ہے؟ **سمپل** سا تو معاملہ ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ اور تحریر میں اس حقیقت کی ریپری زنٹیشن ہوتی ہے۔ اسے **ممیس** کہتے ہیں۔ **سمپل!**[۱۷]

دیکھو۔ آئی ایم ورکڈ اپ اینڈ آئی نو یو آر ورکڈ اپ ایز ویل۔[۱۸]

بھائی، ہیو یو ایور ٹرائیڈ اینی آف دیم؟[۱۹]

استاذ، سرکٹ ٹوٹ گیا تھا۔[۲۰]

درج بالا امثال میں جملے کے آغاز اور اختتام پر جوڑے گئے دوسری زبانوں کے ٹکڑوں کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے۔ پہلی دو امثال میں انگریزی جملوں کے آغاز میں اردو الفاظ "دیکھو" اور "بھائی" لگائے گئے ہیں۔ تیسری مثال میں اردو جملے کے اختتام پر انگریزی فقرے "دے لوڈ ہیپیلی ایور آفٹر" کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح چوتھی مثال میں اردو جملے کے آغاز میں انگریزی فقرہ "بٹ آئی نو" لگایا گیا ہے۔ آخری مثال میں اردو جملے کے آغاز میں پشتو لفظ "استاذ" کا استعمال کیا گیا ہے۔

تحولِ زبان کی ایک اہم وجہ مختلف زبانیں بولنے والوں کی گفت و شنید ہے۔ تاہم کسی بھی گفت گو میں تحولِ زبان کے مظاہر و نوعیت جاننے کے لیے یہ کچھ سوالات اہمیت کے حامل ہیں:

- زبان میں تحول کہاں واقع ہے؟
- کس حد تک یہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ملاتی ہے؟
- اس کی نوعیت کیا ہے؟ تحولِ زبان کا استعاریت اور زبان کی تبدیلی سے کیا رشتہ ہے؟
- تحولِ زبان کے مظاہر کیا ہیں؟

تحولِ زبان کا تفصیلی مطالعہ ہمیں ان سوالات کے جوابات کھوجنے میں مدد دے گا۔

تحولِ زبان کے وقوع کی بات کی جائے تو یہ مہاجر معاشروں میں زیادہ ملتا ہے۔ اقلیتی لسانی گروہ جب کثیر لسانی گروہوں سے ہم کلام ہوتے ہیں تو معاشرتی تبدیلیوں کے زیرِ اثر مختلف زبانوں کا استعمال شروع کر دیتے

ہیں۔ لہٰذا علاقائی اقلیتوں اور کثیر لسانی مقامی گروہوں کے درمیان تحولِ زبان عام پایا جاتا ہے۔[۲۱] ناول میں مذکورہ منڈی بہاءالدین کا علاقہ قدیم وقتوں میں چک نمبر ۵۲ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ پنجاب کے مرکز میں ہے۔ ۲۰۱۷ء کی مردم شماری کے مطابق یہ آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا ۴۱واں بڑا ضلع ہے۔[۲۲]

ناول میں ایک قصبے مونگ کا ذکر ملتا ہے جو دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ یہ شہر کاشت کاری کے لیے مشہور ہے، نہری نظام بہتر ہونے کی وجہ سے لوگ کاشت کاری سے وابستہ ہیں۔ ناول میں بھی ایک نہر جمڑاؤ کا ذکر ملتا ہے۔ مختلف جگہوں سے آ کر لوگ اس علاقے میں آباد ہوئے لہٰذا یہاں مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ گو مقامی زبان کا درجہ پنجابی کو حاصل ہے اور قریباً آبادی کا ۵۷ فی صد حصہ پنجابی زبان بولتا ہے۔ اس کے علاوہ سرائیکی، اردو، پشتو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ تحولِ زبان کا استعمال ہمیں اوپر بیان کیے گئے نکتے کے مطابق ناول میں متعدد جگہوں پر ملتا ہے۔

تحولِ زبان مستحکم ذو لسانی گروہوں کی خصوصیت کے طور پر جانا جاتا ہے یعنی وہ معاشرے جہاں افراد دو یا زائد زبانیں جانتے ہیں وہاں مختلف سیاق و سباق کے ساتھ تحولِ زبان مختلف علامتوں کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے لہٰذا تحولِ زبان دو یا زائد زبانوں کے درمیان رابطے کا ممکنہ نتیجہ ہے۔[۲۳] جیسا کہ ناول میں باب چہارم میں پشتو، پنجابی اور اردو کا استعمال نظر آتا ہے اسی طرح باب پنجم میں اقبال محمد خان کا موقع محل دیکھتے ہوئے پنجابی اور اردو کا استعمال کرنا۔ اس کے علاوہ پورے ناول میں ہمیں اردو کے ساتھ جابجا انگریزی کا استعمال دکھائی دیتا ہے جیسا کہ ہمارے ہاں اب ان دو زبانوں کا ایک ساتھ استعمال عام ہے۔ دونوں زبانیں پاکستان کا ایک بڑا حصہ سمجھتا اور استعمال کرتا ہے۔ گو کہ زبان کے مطالعے میں اکثر اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بعض اوقات اہم موضوع کے طور پر زیرِ بحث بھی لایا جاتا ہے۔

تحولِ زبان سماجی اختلافات اور رجحانات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس کے تحت ذو لسانی گروہوں میں زبانوں کی خصوصیات کو متاثر کیے بغیر متبادل کے طور پر دوسری زبان استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تحولِ زبان بعض صورتوں میں قواعد کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے جو مستحکم اصولوں کے تحت نہیں ہوتا بلکہ زبان کی تبدیلی کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک ہی معاشرے اور زبان کے امتزاج میں زبان کے رابطے میں تحولِ زبان کے مقام پر ایک اہم سوال یہ ہے کہ کس حد تک یہ دونوں اقسام کو قریب لانے کا طریقہ کار ہے۔[۲۴]

اس کی امثال ہمیں ناول میں انتہا پسندوں کی اپنی جماعت میں پشتو کے علاوہ اردو کے، جو قومی زبان کا درجہ بھی رکھتی ہے، استعمال میں نظر آتی ہے، مثلاً:

اس کا عقل **چوٹا** ہے" اسی طرح "سنا ہے **کچ** دنوں میں وہ **کراچے آنے والا ہے**۔ وہ ایک بار آجائے، **پروبلم** اس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔[۲۵]

اقبال محمد خان کے مقامی باشندگان جیسے عالم گیر اور اس کے شوہر شوکت کے ساتھ مکالموں میں تحولِ زبان کا استعمال معاشرے اور زبان کے امتزاج ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح بالے کی حافظ کے ساتھ گفت گو جس میں وہ پہلی دفعہ ناول میں اردو زبان کا استعمال کرتا دکھائی دیتا ہے، عالم گیر کی اقبال محمد خان اور پھر آفتاب اقبال کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے کی سعی کرنا۔ ذیل میں اس کی امثال دی گئی ہیں:

صاحب جی، **بوا** کھلا ہوا ہے۔[۲۶]

اب کیارہ گیا ہے؟ بچوں کا اجڑ ہے۔ ہر وقت کا **چیخ چہاڑا**۔[۲۷]

پتانئیں کیسے جی۔ یہ تو اللہ کے کام ہیں۔[۲۸]

"بوا"، "چیخ چہاڑا" اور "پتانئیں کیسے جی" وغیرہ عالم گیر کی ٹوٹی پھوٹی اردو کی امثال ہیں۔

اقبال محمد خان کی عالم گیر سے پہلی ملاقات کے وقت پنجابی میں ہم کلام ہونا جیسے:

کون ایں توں؟، **کتھو دی ایں؟**[۲۹]

(کون ہو تم؟ کہاں رہتی ہو؟)

لیکن اپنے ہاں کوارٹر میں رہائش دینے کے بعد عالم گیر سے ملاقات کرتے ہوئے اپنے افسرانہ وقار کے پیش نظر اردو کا استعمال بھی ہمیں نظر آتا ہے:

کتنے بچے ہیں تمھارے؟[۳۰]

زبان کی تبدیلی اکثر تب وجود میں آتی ہے جب اقلیتی گروہ ذو لسانی بن جاتا ہے اور ثانوی زبان کی خصوصیات اپنالیتا ہے جیسا کہ یونانی زبان بولنے کے معاملے میں ہوا۔ جو ایشیا ترکی کی چھوٹی موٹی خصوصیات کو اپنا رہا ہے۔ ایک عمومی قاعدے کے طور پر یہ اکثریت کی زبان اقلیتی گروہ اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہ رجحان دوسرے سے متصادم ہے یعنی اشرافیہ کی زبان ماتحت گروہ اختیار کرتا ہے اور تعریف کے لحاظ سے اشرافیہ اقلیت میں ہوتے ہیں۔[۳۱]

اول الذکر نکتے کے مطابق اکثریت کی زبان اقلیتی گروہ اختیار کر لیتا ہے تو منڈی بہاء الدین کے علاقے کی زبان پنجابی ہے جو وہاں کی اکثریت بول اور سمجھ رہی ہے، ناول میں اقبال محمد خان ہمیں اکثریت کی زبان کا بیش تر

مقامات پر استعمال کرتے دکھائی دیے۔ عالم گیر کے ساتھ ابتدائی ملاقات میں بھی اور اس کے بعد بھی کہیں اردو اور کہیں پنجابی زبان ان کے مکالموں میں ملتی ہے۔ مثلاً پہلی ملاقات میں کہتے ہیں:

ایہہ شکار والا علاقہ اے۔ ویکھ کے آیا کر، کدی فیر شیر وی لگ جاندا اے۔ [۳۲]

(یہ شکار والا علاقہ ہے، دیکھ کر آیا کرو۔ کبھی شیر بھی نکل آتا ہے۔)

اور اپنے ہاں رہائش دینے کے بعد ایسے مخاطب ہوتے ہیں:

ایہہ کھالے۔ تے کسے نوں ناں دسیں۔ [۳۳]

(یہ کھالو تو کسی کو مت بتانا۔)

اس کے علاوہ انتہا پسندوں کا اپنی جماعت میں خواتین کے لیے عامیانہ زبان کا استعمال کیا جانا جیسے:

سب رنڈیاں ہیں یہ! [۳۴]

ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے طالبات کی سہولت کے لیے قومی زبان کا استعمال بھی اسی اوپر والی مثال کے ذیل میں آتا ہے کیوں کہ انتہا پسندوں کی جماعت میں ملک کے بیش تر حصوں سے طالب علم شامل ہوتے ہیں لیکن موخر الذکر نکتہ جس کے مطابق اشرافیہ کی زبان ماتحت گروہ اختیار کرتا ہے تو یہ صورت حال بھی ہمیں ناول میں نظر آتی ہے۔ جیسے اقبال محمد خان کا طبقۂ اشرافیہ سے منسلک ہے، ان کا ماتحت ملازم ان کے ساتھ اردو بولنے کی اپنے تیئں کوشش کرتا ہے۔ درج امثال میں پنجابی ملاوٹ والے الفاظ کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے۔

ایک کڑی ہوتی تھی جی عالم گیر نام کی۔ [۳۵]

اسی طرح عالمگیر اردو پنجابی کا ایسا ملا جلا استعمال کرتی ہے:

وہ لیدھر گیا ہے۔ اپنے مامے کے پاس۔ اس کے مامے کی دھی کا وہاں کسی سے چکر چل رہا ہے۔ [۳۶]

پینی لوپ لکھتی ہیں کہ تحولِ زبان زیادہ تر معاشروں میں اس کا استعمال کرنے والے کی عمر اور تحولِ زبان کی قسم پر منحصر ہے۔ اس لیے معاشرے میں تعلیم یافتہ نوجوان اور ان پڑھ بوڑھے کی گفت گو میں فرق ہو گا۔ ناول میں کرداروں کی زبان کا جائزہ لیں تو عالم گیر، بالا اور شوکت جو ان پڑھ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی زبان عامیانہ نوعیت کی ہے جب کہ دوسری طرف باقی تعلیم یافتہ کرداروں اقبال محمد خان، جاوید اقبال، آفتاب اقبال اور نسوانی کرداروں سلمیٰ، مشعال، امتہ الکریم اور سلمیٰ کی زبان سنجیدہ اور مہذب ہے۔ مصنفہ کا مزید کہنا ہے کہ انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں میں تجارت، مذہبی اور دیگر امور کے لیے تحولِ زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ لغوی مستعاریت (Lexical borrowing) اور ادغامِ زبان(Code Mixing) بھی ذولسانیت

(Bilingualism) اور تحولِ زبان میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تحولِ زبان اور مستعاریت سے متعلق کئی مباحث اہمیت کے حامل ہیں۔ تحول زبان بہت سی ہیں صورتوں میں یک لفظی بھی ہو سکتا ہے گو کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ مفرد لفظ کے ساتھ کچھ اسماوغیرہ مستعار بھی لیے جاتے ہیں۔ یہ حروف متعلقہ قواعدی زمرے کے سائز کی عکاسی کرتے ہیں۔[۳۷]

تم **اچھی فیملی** کے ہو۔[۳۸]

صاحب جی، **بوا** کھلا ہوا ہے۔[۳۹]

مفرد الفاظ، مستعاریت اور زبانوں کی تبدیلی ہمیشہ نہیں لیکن کئی صورتوں میں تحولِ زبان ہی کی قسم ہوتے ہیں۔ زبان کا کوئی سا بھی پہلو ہو اپنی ساخت سمیت مستعار لیا جا سکتا ہے۔ روزمرہ زندگی سے بھی اس کی مثالیں لی جا سکتی ہیں کہ ہم قومی زبان اردو بولتے ہوئے بھی اکثر اپنی مادری زبانوں کے فقرے یا جملے بول لیتے ہیں یا اکثر انگریزی کے پورے فقروں یا جملوں کو اس کی ساخت سمیت استعمال کر لیتے ہیں۔

مفرد الفاظ (single words) کے ساتھ اسم نکرہ زیادہ مستعار لیے جاتے ہیں اس کی وضاحت تھیوڈورا بائنون (Theodora Bynon: 1936) یوں کرتی ہیں کہ یہ متعلقہ قواعدی زمرے کے سائز کی عکاسی کرتے ہیں۔ مفرد لفظی تبدل کی ایک وجہ یہ ہے کہ جس زبان سے لفظ مستعار لیے جاتے ہیں ذو لسانی گروہوں کی ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔[۴۰] جیسے کہ:

"مثلاً **سینئر** صاحب؟"[۴۱]

"نہیں **سر**"[۴۲]

درج بالا امثال میں "سینئر" اور "سر" بالترتیب انگریزی اور پنجابی زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔ یہ اسما نکرہ ہیں اور انھیں تنہا الفاظ کے ساتھ مستعار لیا گیا ہے۔ اسما سب سے زیادہ مستعار لیے اور منتقل کیے جاتے ہیں۔[۴۳]

مثال کے طور پر:

ٹیبل، استاذ، پارٹیز، مینٹل انرجی اور سوسائٹی وغیرہ۔

اسما کی درج بالا امثال ناول ہی سے لی گئی ہیں۔

تمام قواعدی زمرے ممکنہ طور پر اور الفاظ قواعدی طور پر اپنے خود ساختہ کردار کی بدولت قابلِ منتقل ہوتے ہیں۔ ہر زبان کے قواعد مختلف ہوتے ہیں تاکہ ہر جملہ بنانے کے اصول میں فرق کیا جا سکے۔ جیسا کہ اردو اور انگریزی میں جملہ بنانے کے قواعد یک سر مختلف ہیں۔[۴۴] ذیل میں مثال دی گئی ہے:

اردو جملے کا قاعدہ:

مبرا نے کپڑوں کی خریداری کر لی ہے۔

انگریزی جملے کا قاعدہ:

Mubarra has bought the dresses.

اردو جملے کی ترتیب فاعل، مفعول اور پھر فعل ہے جب کہ انگریزی جملے کی ترتیب فاعل، فعل اور مفعول ہے۔

ایک سے دوسری زبان میں تحول کے وقت کچھ صرفی اور نحوی قواعد اپنائے جاتے ہیں اور کچھ نہیں۔ دوسری زبان کے الفاظ قبول کرتے ہوئے ہم اس کی قواعدی حیثیت کو دیکھتے ہیں۔ کچھ ڈیٹا سیٹ میں تحولِ زبان کی دیگر اقسام زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔ پنجابی-انگریزی ذولسانوں کے تقابلی مطالعے میں مفرد لفظ کا دروں جملوی تحولِ زبان پنجابیوں میں تین گنا زیادہ تیز ہوتا ہے جب کہ یونانی قبرصی اور انگریزی میں مفرد لفظ کی تبدیلی تیز ہوتی ہے۔[۴۵]

متکلم کسی بھی تصور کو دوسری زبان میں منتقل کر سکتا ہے۔ بعض اوقات یہ الفاظ دوسری زبان ہی کے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ جیسے انگریزی کے کئی الفاظ اردو میں رائج ہو کر اس کا حصہ بن گئے ہیں۔ الفاظ کے علاوہ بعض اوقات پوری پوری اصطلاحات بھی دوسری زبان میں استعمال کی جاتی ہیں۔ مختلف زبانوں میں جملے کی ساخت مختلف ہوتی ہے۔ قواعدی خصوصیات کی جگہ ہر زبان میں مختلف ہوتی ہے جیسے اردو میں فعل جملے کے آخر میں مگر انگریزی میں جملے کے آغاز میں اسم کے فوراً بعد آجاتا ہے۔ جب کسی دوسری زبان کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں تو قواعد کا خاص خیال رکھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اوقات قواعد ایک زبان کی جب کہ جملے کی ساخت دوسری زبان کی استعمال کی جاتی ہے۔[۴۶]

بیکس (Backus) تحولِ زبان اور ساختیاتی تبدیلی کے درمیان تعلقات کی پیچیدگی کی وضاحت کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ کئی مسائل کی فہرست دیتا ہے جن میں اطلاقی اور نظریاتی دونوں شامل ہیں۔ اس مفروضے کے ساتھ کہ ساختی تبدیلی تحولِ زبان کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر **اطلاقی سطح** پر یک لسانی گفت گو کے اندر یہ ثابت کرنے کے لیے تحولِ زبان صرف زبان کی تبدیلی کی وجہ سے رونما ہوئی، ایک ساخت (structure) کے تنوع (variation) کی مکمل تصویر کشی کی ضرورت ہو گی۔ اس کے لیے تحولِ زبان کی کسی بھی قسم یا کسی بھی ساخت کو ناول کے اقتباسات پر اطلاق کر کے دیکھ لیا جائے تو زبان کی تبدیلی کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ **نظریاتی سطح پر** یہ سمجھنے کی ضرورت ہو گی کہ کیسے تحولِ زبان، زبان کی ساخت میں تبدیلی لا سکتی ہے اور اسے دوسری پرتوں سے کیسے فرق کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک زبان کے الفاظ یا فقرے دوسری زبان میں استعمال ہوتے ہوئے اس کی ساخت میں تبدیلی لاتے

ہیں۔[۴۷] اوپر بھی مثال کے ذریعے اس نکتے کی نشان دہی کی جا چکی ہے کہ انگریزی اور اردو جملوں کی ساخت میں نمایاں فرق ہے۔ دونوں زبانوں کے الفاظ کو جب آپس میں خلط ملط کیا جائے تو ان کی ساخت میں فرق آتا ہے۔

پینی لوپ گارڈنر کا کہنا ہے کہ زیادہ تر معاشروں میں جہاں تحولِ زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ متکلموں کی عمر اور تحولِ زبان کی قسم جو وہ استعمال کرتے ہیں، میں ایک تعلق پایا جاتا ہے۔ ذولسانیت اور تحولِ زبان متن کی لغوی استعاریت اور زبانوں کے اختلاط میں اہم کردار ادا کرتی ہیں نیز انگریزی کی قواعدی خصوصیات کو دوسری زبان میں پہنچانے میں دل چسپ معلومات فراہم کرتی ہیں۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ تحولِ زبان ایسے تناظر میں ہوتا ہے جہاں تبدیلی کے بجائے ترقی کی تشکیل ہوتی ہے۔ تحولِ زبان کے ابتدائی مطالعے میں ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں دو متعلقہ اقسام کافی حد تک قواعدی سطح پر متحد ہوتی ہیں۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ مختلف گروہ کئی دہائیوں تک ساتھ رہنے کے باوجود بھی اگر اپنا اپنا لغوی ذخیرہ برقرار رکھیں تو ان کے درمیان آپس کے مخصوص اختلافات باقی رہتے ہیں۔ جب کہ رینڈلر شیرو (Rindler Schjerve: 1948- 2013) اطالوی-ساردینی تحولِ زبان (Italian- Sardinian CS) کے مطالعے میں زور دیتی ہیں کہ اگرچہ ایک سے دوسری زبان میں منتقلی زبان کی تبدیلی کے تناظر میں ہوتی ہے لیکن اسے ایسا طریقہ کار نہیں سمجھ لینا چاہیے جو تبدیلی کو تیز کرتا ہے۔ ساردینیا میں ذولسانیت زیادہ متوازن ہے جو سب سے زیادہ زبانوں کا تحول کرتی ہے اور دوسری زبانوں کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے لہٰذا اسے اکثریتی زبان کے طور پر قبول کر کے دو قریبی متعلقہ زبانوں کے درمیان فرق کو کم کیا جا سکتا ہے۔ تحولِ زبان وسیع پیمانے پر استحکام کی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔[۴۸]

زبان کی تبدیلی کے متعلق مختلف مکتبہ ہائے فکر کے ہاں مختلف آرا پائی جاتی ہیں جیسا کہ گمپرز اور ولسن (Gumperz and Wilson) کے مطابق تبدیلی سست اور تیز ہو سکتی ہے۔ یہ زبان کے تمام پہلوؤں کو متاثر کر سکتی ہے۔ اسی طرح ٹرڈگل (Trudgill) کا کہنا ہے "یہ تبدیلی مختلف جنریشنز میں بھی ہو سکتی ہے اور ایک میں بھی۔ لیکن ان کا پتا لگانا مشکل ہوتا ہے۔ ان کے نقصانات تحولِ زبان کے ذریعے نقاب پوش ہوتے ہیں۔"[۴۹]

تھیوڈورا بائنون اس کی وضاحت یوں کرتی ہیں کہ یہ صرف متعلقہ قواعدی زمروں کے حجم کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک اور وضاحت جین ایچسون (Jean Aitchison:1938) یوں کرتی ہیں کہ اسما دوسرے قواعدی الفاظ کے مقابلے میں نحوی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں تنہا الفاظ کے تحول یا مستعار لیے جانے کی ایک وجہ یہ ہے کہ جن زبانوں سے الفاظ مستعار لیے جاتے ہیں ذولسانوں کے لیے قابلِ رسائی ہوتی ہیں۔ اس زبان کے لیے جس سے لفظ مستعار لیے جا رہے ہوں استعاریت اور تحولِ زبان کے درمیان کوئی معتبر نحوی امتیاز نہیں ہے۔ مستعار الفاظ زبان ہی

کی تبدیلی کے طور پر شروع ہوتے ہیں اور پھر مستعار زبان کے متکلموں کے درمیان عام ہو جاتے ہیں۔ اردو میں مستعار الفاظ کی بے شمار مثالیں ہیں۔ جیسے:

اُونگھ (سنسکرت)، تحریر (عربی)، کلاس (لاطینی)، طلوع (عربی)، دل (فارسی)، دروازہ (فارسی) اور پھول (سنسکرت) وغیرہ۔

درج بالا مستعار الفاظ کی مثالیں ناول سے لی گئی ہیں۔

ایچیسون اپنے نظریے کی ترویج میں مزید کہتی ہیں کہ جب رابطے کی دو ایک جیسی زبانوں میں مختلف تاریخی سطحوں پر مستعاریت ہو تو مستعار الفاظ، یکجائی[۵۰] (integration) کے بالکل مختلف عمل سے گزر سکتے ہیں اور بالآخر مستند (receiving) زبان سے مختلف نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ فرانسیسی افعال ابتدائی فرانسیسی نو آبادیاتی دور میں مراکشی عربی میں بنا کسی مبہم فعلی ڈھانچے کے مستعار لیے گئے تھے اور دوسرے جو حال ہی میں مستعار لیے گئے ہیں، انھیں مراکشی عربی مبہم ڈھانچہ فراہم کیا گیا ہے۔ ان کے اصوات بھی مستعار لیے جاتے ہیں جو استحکامت کو ظاہر کرتے ہیں۔[۵۱] یعنی اب فرانسیسی افعال مراکشی عربی ڈھانچہ رکھتے ہیں اور اپنی اصل سے بالکل مختلف ہیں۔

مستعاریت کی طرح تحولِ زبان بھی صرفِ نطقیائی[۵۲] (Morphophonemically) طور پر مستعار زبان کے ساتھ مربوط ہے۔[۵۳]

مستعاریت اور تحولِ زبان کی کچھ مثالیں مستعار زبان میں لغوی خلا کو پورا کرتی ہیں اور مقامی برابری کے لیے اپنے آپ کو بہ طور انتخاب شامل کرتے ہیں۔ تحولِ زبان کسی لفظ یا تاثیر کے لیے کسی لفظ کی دست یابی کی نااہلی کے طور پر نہیں پایا جاتا بلکہ یہ اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ تحولِ زبان کی عام گفت گو جو کسی دوسری زبان میں جو کچھ کہا ہوا ہوا سے دہراتا ہے۔[۵۴] مثلاً:

ساری سندھ پریئیں جو پاچھو۔ کسی سندھی شاعر نے کہا ہے کہ ساری سندھ میری محبوب کا سایہ ہے۔[۵۵]

ناول میں اردو ترجمہ کرتے ہوئے تذکیر و تانیث ایسے ہی استعمال کی گئی ہے۔

ذولسانی والدین بچوں کے ساتھ کسی مسئلے پر بات کرتے ہوئے اکثر نرم یا سخت لہجے میں دوسری زبان میں اپنی کی گئی بات کو دہراتے ہیں۔ جو اکثر روزمرہ زندگی میں مشاہدے میں آتی ہے۔ تحولِ زبان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متکلم ایسا اس لیے کرتا ہے کہ دوسری زبان میں سب سے درست اصطلاح موجود ہوتی ہے۔[۵۶] ذیل میں کچھ امثال دی گئی ہیں:

وہ میں اپنے **ٹی وی چینل** کے لیے ایک **رپورٹ** بنا رہا ہوں اس جگہ پر۔[۵۷]

ان کی **جی ڈی پی گروتھ** جتنی مرضی ہو جائے، وہ مغرب سے نیچے ہی رہیں گے۔[۵۸]

وہ اس وقت **اری گیشن سروے ڈپارٹمنٹ** میں ملازم تھا۔[۵۹]

جب **مینٹل انرجی** کو کوئی **آؤٹ لیٹ** نہ مل رہا ہو تو وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو ابو کرتے تھے۔[۶۰]

گو کہ درج بالا خط کشیدہ الفاظ اردو میں بھی اپنے مفاہیم رکھتے ہیں مگر بہترین اصطلاحات جو اب اردو زبان میں موجود بھی ہیں اور زیادہ بہتر طور پر جانی جاتی ہیں وہ انگریزی کی یہی اصطلاحات ہیں جو مصنف نے استعمال کی ہیں۔

مخصوص سیاق و سباق میں بولی جانے والی مخلوط زبانیں ایک زبان کے محدود گروہ کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ ان کی سماجی پیدائش ان کی قواعدی بنت کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔ زیادہ تر زبانیں کسی حد تک مخلوط ہیں اور مخلوط زبانیں ایک خاص قسم کی توجہ مرکوز کرنے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں شامل عمل بنیادی طور پر رابطے کی شکلوں سے مختلف نہیں ہیں۔[۶۱]

یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زبان کی تبدیلی کے بہت سے پہلو رابطے کی وجہ سے ہیں۔ اس کے برعکس یہ رابطہ وقت کی مختصر یا طویل مدت کی تبدیلی کو بڑھاتا ہے۔[۶۲]

تحول زبان ایسے معاشروں میں بھی وجود میں آتی ہے جہاں اقلیتی لسانی گروہ اکثریتی لسانی گروہوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ تحولِ زبان کے سماجی عناصر پر بحث کریں تو جان جے گمپرز (John J. Gumperz: 1922-2013) جس کا ابتدائی کام تحولِ زبان پر تھا انھوں نے دہلی سے ناروے تک کے تناظر میں تحولِ زبان کی تاریخی پیدائش، اس کے لسانی نتائج، متکلم کے لیے اس کی اہمیت اور گفت گو کے کام کے نقطۂ نظر سے تحقیق کی۔ یہ بحث ان کے تجزیے کے دو پہلوؤں پر مرکوز ہے جو بدستور بااثر ہیں۔ یعنی We code اور They code نیز استعاراتی اور عبوری تحولِ زبان کے درمیان تمیز۔ وہ اقلیتی زبان کو We code اور اکثریتی زبان کو They code کا نام دیتے ہیں۔ اقلیتی گروہ، گروہ کے اندر غیر رسمی سرگرمیاں رکھتی ہیں اور اکثریتی گروہ رسمی سرگرمیاں گروہ سے باہر رکھتے ہیں۔ اکثر ایک ہی کلام کے اندر دونوں اصطلاحات استعمال ہو رہی ہوتی ہیں۔[۶۳]

ناول میں منڈی بہاءالدین کے عوام کی زبان یعنی "پنجابی" We Code کہلائے گی جب کہ "اردو" زبان They Code کہلائے گی۔ لیکن یہی اردو زبان ناول کے باقی کرداروں کے لیے We Code کا درجہ رکھتی ہے کیوں کہ وہ دروں و بیرونی سرگرمیوں میں کلام کرتے ہوئے اس زبان کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ انگریزی کا اردو کے ساتھ ملاپ انگریزی کو They Code کا درجہ دے گا۔

گمپرز اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لسانی شکلوں(forms) کے کسی خاص مجموعے کے وقوع اور غیر لسانی سیاق وسباق کے درمیان بالواسطہ تعلق ہے اور بہت کم صورت حال ایسی ہیں جہاں ایک کوڈ خاص طور پر مناسب ہوتا ہے دوسری جگہوں پر کئی اختیارات ہوتے ہیں اور جیسا کہ عمومی طور پر پیغامات کی تشریح کا بڑے پیمانے پر معاملہ ہے۔ تقریری و تحریری سیاق وسباق (Discourse Context) سماجی پیش گوئیاں اور متکلم کا پس منظری علم۔ تحولِ زبان میں we codeاور they code عام طور پر ایک ہی گفت گو میں استعمال ہوتے ہیں۔راجندر اسنگھ(Rajendra Singh:1943-2012) کہتے ہیں کہ اقلیتی زبان عام طور پر we code ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر انڈیا میں متکلم سماجی خواہشات کے لیے انگریزی کو بہ طور we code استعمال کرتا ہے جب کہ ہندی کا استعمال غیر اراد تاًیعنی جانے ان جانے میں کرتا ہے۔ [۶۴]

تحولِ زبان کے سماجی عناصر کی بات کی جائے تو یہ سماجی عناصر کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو فیصلہ کرتا ہے کہ آیا تحولِ زبان کسی بھی کلام میں ہے یا نہیں۔ معاشرتی اور معاشی تغیرات سے کسی بھی زبان میں مکالمے کی صورت طے ہوتی ہے۔ سماجی لسانیات کے نقطۂ نظر سے سماجی عناصر کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے وہ عناصر جو مخصوص متکلم اور مخصوص حالات پر انحصار کرتے ہیں کہ کون سی قسم کی گفت گو کی جارہی ہے۔ مخصوص ماحول میں متعلقہ زبان کا افراد کے سیاق سے تعلق، اندازِ زندگی اور طاقت کا اقتدار۔

ٹی وی پروگرامز میں مشعال کی مخصوص حالات میں استعمال کی جانے والی زبان، بالے کی گاؤں میں ماں بہنوں سے مکالمے میں استعمال کی جانے والی زبان اور انتہا پسندوں میں شامل ہونے کی بعد استعمال کی جانے والی زبان میں فرق نظر آتا ہے۔ اسی طرح اقبال محمد خان کی اپنی بیگمات کے ساتھ کی جانے والی گفت گو نیز عالم گیر کی ساتھ تنہائی میں کیے جانے والے مکالموں میں یہ صورت مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔

۲۔ دوسرے وہ عناصر جو متکلم سے متعلق ہوتے ہیں۔ انفرادی یا اجتماعی طور پر سماجی دائرہ کار اور تعلقات، ان کے رویے، نظریات، ذاتی نقطۂ نظر اور دوسروں کے تاثرات۔

اقبال محمد خان کا پہلی ملاقات میں عالم گیر کو پنجابی زبان میں مخاطب کرنا لیکن بعد ازاں اپنے ہاں اس کے شوہر کو ملازمت دینے کے بعد اپنے وقار کا خیال رکھتے ہوئے عالم گیر کے ساتھ مکالمے کے دوران اردو زبان کا انتخاب کرنا۔

۳۔ تیسری قسم میں مکالمے کے اندر جہاں تحولِ زبان ہورہا ہو۔ [۶۵]

- Kal tum bhool to nahi jao gi na?
- Kya?

- That you have agreed?
- Ok baba. Ok [۲۶]

تحولِ زبان متکلم کے لیے ایک اہم مکالماتی ذریعہ ہے جو انھیں ان کا ڈسکورس بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ یک لسانی گروہوں کے پاس گفت گو کی تشکیل کے اتنے طریقے نہیں ہوتے جتنے ذولسانی کے پاس۔

تینوں عناصر میں باہم تعلق پایا جاتا ہے اور تحولِ زبان کو جاننے کے لیے ان کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ درجہ بندی سماجی عناصر کی بڑی تعداد کو ایک جھلک کی صورت میں پیش کرتی ہے جو نہ تو لسانی اداروں سے وابستہ ہوتی ہے اور نہ ہی نفسیاتی لسانی اداروں سے۔ ان کا اطلاق سماجی لسانیاتی ہوتا ہے جو عمر، نیٹ ورک اور شناخت جیسے عناصر سے منسلک ہے۔

دوسری تیسری جنریشن کے افراد اپنے بزرگوں سے جتنی انسیت رکھتے ہیں اتنا ہی ان کی زبان کو سمجھتے ہیں۔ لسانیاتی اور سماجی لسانیاتی عوامل کا اندازہ لگانے کے لیے جہاں تحولِ زبان ہو رہا ہو وہاں مختلف حالتوں کا منظم طریقے سے موازنہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی ایسے حالات جہاں مختلف زبانیں ایک دوسرے سے قریب ہوں انھیں ان حالات سے جہاں زبانیں دور ہوں، کا تقابل کرنا چاہیے۔ اسی طرح سماجی لسانیاتی عناصر کی اہمیت ایسے سماجی حالات میں جو ایک جیسے ہوں اور جو ایک جیسے نہ ہوں کے مقابلے سے جانچا جا سکتا ہے۔ یہ انتہائی مختلف فرق ہیں۔

بعض اوقات متکلم کے تحولِ زبان کا انحصار دوسرے متکلم کے تحولِ زبان پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ اس نے پہلے مکالمے میں تحولِ زبان کا استعمال کیا۔[۲۷] ناول میں خواہ اردو انگریزی کے امتزاج پر مبنی گفت گو ہو یا پنجابی، انگریزی مکالمات مخاطب کو دیکھتے ہوئے زبان کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

- To phir kya boleen.
- Unhon ne tumhen TV per dekha hai.

  She likes you.
- Oh really?

  Acha tum kuch kehnay walay thay
- Yes she likes you

  But not more than me
- You mean you like me?

  Bas yahi baat batani thi? [۲۸]

دو یک لسانی گروہوں میں تحولِ زبان کم جب کہ یک لسانی گروہ کے کسی دوسری زبان سے مکالمے میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

خاندان کے افراد کی نسبت، کام کی جگہ، ساتھیوں کے ساتھ گفت گو میں تحولِ زبان زیادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی خاندان کی نسبت ایسے افراد جن سے تعامل کم ہو تحولِ زبان کا استعمال کم ہوتا ہے۔[۶۹]

جاوید کے ان مکالموں میں جو والدہ کے ساتھ تھے، کی نسبت مشعال کے ساتھ مکالموں میں اردو انگریزی کا امتزاج زیادہ ملتا ہے۔ اسی طرح اقبال محمد اور عالم گیر کے مکالموں میں تحولِ زبان زیادہ ملتا ہے یعنی کہ رسمی گفت گو میں تحولِ زبان زیادہ اور غیر رسمی گفت گو میں کم ہوتا ہے۔

بعض اوقات اسم، فعل اور صفت وغیرہ دوسری زبان میں مستعمل ہوتے ہوئے ایک نیا مرکب بنا دیتے ہیں۔ ان کی ساخت دوسری زبانوں میں مختلف ہو جاتی ہے۔[۷۰] اردو میں اس کی مثال مرکب "لب کشا" سے لی جاسکتی ہے۔ "لب" اردو لفظ ہے جب کہ اس کے ساتھ فارسی لاحقہ "کشا" جوڑ کر نیا مرکب بنا دیا گیا ہے اسی طرح ساخت کے بدلاؤ کی مثال کے طور پر 'سیارۃ جدید"۔ عربی میں صفت بعد میں اور موصوف پہلے لگایا جاتا ہے لیکن اگر ہم "جدید' صفت کو اردو میں استعمال کریں گے موصوف سے پہلے استعمال ہو گی جیسے 'جدید گاڑی"۔ ناول میں ان امثال کو دیکھا جائے تو:

لیکن مولانا، یہ شخص تو شریعت کی خاطر **خواتین کا ریپ** کر رہا ہے۔[۷۱]

کیا میں کوئی **تھرڈ کلاس ماسی** ہوں؟[۷۲]

ریالٹی کی ہر نمائندگی ایڈیٹیڈ ہوتی ہے۔[۷۳]

درج بالا امثال میں خط کشیدہ انگریزی الفاظ اردو الفاظ کے ساتھ مل کر ایک نئی ترکیب بنا رہے ہیں۔

"خواتین کا ریپ" مرکب اضافی کی مثال، "تھرڈ کلاس ماسی" صفت اور "ریالٹی کی ہر نمائندگی" اسم کی ایک مثال ہے۔

مکالمات میں سماجی زبانوں کی مختلف اقسام کی شراکتوں سے تحولِ زبان کا رجحان مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف ڈھانچے اور تفاعل پر توجہ دیتا ہے بلکہ اس طرح کے ذولسانی رویے کی نظریاتی اقدار پر بھی۔ مکالمات میں تحولِ زبان کے درج ذیل تین سماجی لسانیاتی عزائم ہیں۔

- ✓ مکالماتی / اشاراتی (علامتی) محرکات
- ✓ سماجی نفسیاتی اثرات

✓ صنف [۷۴]

مکالماتی/ اشاراتی (علامتی) محرکات:

گمپرز تحولِ زبان کو سیاق و سباق کے ساتھ زبانی یا اشاراتی علامتوں سے منسلک کرتا ہے اور کسی پیغام کے لیے وضاحتی ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں۔ کسی بھی مکالمے میں اقتباس، مخاطب کی تفصیلات، رکاوٹ، اعادہ/ منتقلی، تعلیم۔ اعتراضات، ذاتیات کی صورت میں تبدیلی ممکن ہے۔ **مائرس اسکاٹن** نشان داری کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ جس کے تحت افعال کو زیادہ جامع نمونے میں ختم کرنے کے کوشش کی جاتی ہے۔ مائرس اسکاٹن اس سوال کا جواب دیتی ہیں کہ ذو لسانی متکلموں کو دو زبانوں میں گفت گو کرتے ہوئے کیا حاصل ہوتا ہے جب کہ وہ ایک زبان میں بھی لگاتار بول سکتے ہیں۔ وہ سماجی رکاوٹوں کے رویے کے انتخابات کو جوڑنے کے لیے کئی نظریات کو پیش کرتی ہیں، جو طاقت اور یک یکجہتی پر منحصر ہیں۔ اس نظریے کی ترویج میں انھوں نے ذولسانی متکلموں کو عقلی فاعلوں (rational actors) کے طور پر پیش کیا ہے۔ جو سماجی اصولوں سے مجبور ہیں۔ انھیں زبان کے انتخاب کا اختیار ہوتا ہے جو مروجہ سماجی اصولوں کے مطابق ہو سکتا ہے اور غیر نشان دار کے طور پر جانی جاتی ہے یا متبادل کے طور پر حقوق اور ذمے داروں کے مجموعے کے طور پر۔

تحولِ زبان بذاتِ خود کسی حالت میں غیر نشان دار انتخاب ہے جہاں شناخت (identities) کے دو مجموعے معاشرے میں بیک وقت اشاریہ [۷۵] (index) ہوتے ہیں۔ جب متکلم کسی گفت گو کے لیے اپنے طریقے کو کلام کا فائدہ مند طریقہ محسوس کرتے ہیں تو تحولِ زبان تحقیقی انتخاب بھی ہو سکتا ہے۔ [۷۶]

خاندان کے افراد کے مابین مکالمے کے دوران میں مقامی زبان میں منتقلی غیر نشان دار جب کہ عوامی مکالمے کے دوران میں مقامی زبان میں منتقلی نشان دار انتخاب ہے۔ یہ بہت عام صورت حال ہے گو کہ ہمیں یہ صورت ناول میں نہیں مل رہی مگر روزمرہ زندگی میں ہمارے کئی لمحات ان دونوں صورتوں کو اپناتے گزرتے ہیں۔

اسکاٹن ضابطہ ہائے گفت گو بھی بیان کرتا ہے جو نشان دار انتخاب کے مساوی ہوتا ہے۔ اس مکالمے کے شرکا کے مابین متوقع معاشرتی فاصلے پر ہونے والی تبدیلی پر تبادلۂ خیال کیا جاتا ہے۔

سوزن برٹ (Susan Burt) کہتی ہیں کہ ذو لسانی حالات میں مائرس اسکاٹن کے ماڈل کے اندر میکسیم [۷۷] (maxim) اور ذیلی میکسیم مخالف انتخاب کا باعث بن سکتے ہیں۔ قابلِ احترام میکسیم (deference maxim) ہی بتاتا ہے کہ متکلم مہمانوں کے سامنے مادری زبان استعمال کرتا ہے یعنی ناول میں عالم گیر کا اقبال محمد خان کے ساتھ کلام کرتے ہوئے پنجابی زبان کا انتخاب کرنا۔ لیکن افضل میکسیم (virtuosity maxim) بتاتا ہے کہ

متکلم وہ زبان بولے جو موجود تمام لوگ سمجھتے ہوں۔ انتہا پسندوں کا پشتو زبان سے تعلق رکھتے ہوئے مذہبی جماعت کے اندر اردو زبان کا انتخاب کرنا جو قومی زبان ہے۔ اور قریباً ملک کے ہر گوشے سے تعلق رکھنے والا انسان سمجھتا اور بولتا ہے۔

ایسے موقع پر لغویے کا تنازعہ شروع ہو جاتا ہے اور ایک پر دوسری زبان کو ترجیح دینے کے لیے ایڈہاک کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔[۷۸]

اوور کا کہنا ہے کہ شرکا کے مکالمے میں حرکات (moves) اتنی اہم ہے جتنا کہ بیرونی عوامل کا مطالبہ ہوتا ہے جیسا کہ مائرس اسکاٹن نے زبان کے انتخاب میں وضاحت کی۔ تحولِ زبان کی ایک مثال عدم تعمیل کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتی ہے جو نوجوان اور پرانی پود کی زبان کے درمیان عدم مطابقت کا نتیجہ ہے۔[۷۹] آفتاب کا مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

> " دیکھیں، برا نہ منایئے گا۔ میں اپنے ابو کو جانتا ہوں۔ **وہ بہت رومانٹک، میرا مطلب ہے کہ عورتوں میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔**"[۸۰]

اسی طرح عالم گیر کا مکالمہ دیکھیے:

> "چھوڑیں جی یہ باتیں۔ اب تو وہ عالم گیر رہی ہی نہیں۔ سارا **گراں** کہتا تھا کہ جوانی تو عالم گیر پر آئی ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے؟ بچوں کا **اجڑ** ہے۔ ہر وقت کا **چیخ چہاڑا**۔"[۸۱]

عالم گیر جو ایک ان پڑھ بوڑھی عورت ہے اور آفتاب جوان نئی نسل سے تعلق رکھتا ہے دونوں اپنے مکالموں میں ایک دوسرے کو بات سمجھانے کی غرض سے تحولِ زبان کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

لی وی (Li Wei: 1961) کے مطابق بنیادی زبان کا انتخاب بیک وقت خاندان میں لسانی ترجیحات اور اختیار کے ڈھانچے کی عکاسی کرتا ہے۔[۸۲]

ہمارے ہاں بھی ایسی ہی صورت حال مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

ایسا معاشرہ جہاں تحولِ زبان ہوتا ہے وہاں مختلف زبانوں میں فرق مقامی بولیوں، سماجی زبان اور اندازِ گفت گو کے فرق سے کم نمایاں ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں مخصوص اثرات کے تحت دو زبانوں کا تقابل تحولِ زبان کے استعمال کا ایک طریقہ ہے۔ کسی معاشرے میں زبان کی مختلف اقسام کو کس طرح تعینات کیا جا سکتا ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی بھی گروہ میں حقیقی لسانی طریقوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یک لسانی گروہ کی گفت گو میں تحولِ زبان کو سمجھنے میں مشکل در پیش آتی ہے لہٰذا بات کو دہرانا پڑتا ہے۔

یک لسانی گروہوں میں افعال کی تکمیل کے لیے تاثرات جب کہ ذو لسانی میں تحولِ زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ہی گفت گو میں یک لسانی اور ذو لسانی تقریر کے مسائل جاننے کے لیے یک لسانی اور تحولِ زبان کی حامل گفت گو کا ایک ہی مکالمے میں باہم تقابل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یوں براہِ راست موازنہ کیا گیا کہ جس طرح سے مخصوص مکالمے کو یک لسانی اور تحولِ زبان کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جن مکالموں کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا وہ قریبی تعلقات رکھنے والا پنجابی خاندان تھا جو لندن میں مقیم تھا۔ یہ خاندان تحولِ زبان کا استعمال کرتا تھا۔ دو زبانیں یعنی پنجابی اور انگریزی استعمال کی جاتی تھی۔ ذو لسانی اور یک لسانی عادتاً مکالمے میں ڈسکورس کے استعمال کا موازنہ کیا گیا جس میں عبور[۸۳](Transition) کی چار اقسام پر مرکوز کیا گیا۔ یک لسانی اور تحولِ زبان کی حامل گفت گو کو مکالماتی تناظر میں جانچنے کی توقع کی جائے گی جو یہ ہیں:

۱۔ معاونین(Asides)

۲۔ اقتباسات(Quotations)

۳۔ منتقلی / اعادہ(Reiteration)

۴۔ شقیں / فقرہ(Clauses)[۸۴]

ان چاروں خصوصیات کا رونما ہونا نوٹ کیا جائے گا اور اس بنا پر تقسیم کی جائے گی کہ آیا یہ یک لسانی گفت گو ہے تحولِ زبان کی حامل اور آیا یہ خصوصیات زبان میں تبدیلی کا سبب ہیں بھی یا نہیں۔

معاونین میں آواز کی پچ کم رکھی جاتی ہے۔ متکلم مخاطب میں استعاراتی تبدیلی (Metaphorical changes) واضح طور پر دیکھتا ہے۔ جیسا کہ معاونین ایک مافوق الطبیعاتی لسانیات[۸۵](Metalinguistic) تبصرہ ہے جس میں متکلم مخاطب سے اتنا ہی مخاطب ہوتا ہے جتنا کہ خود سے۔

ناول میں دیکھیں تو اس کی مثال درج ذیل ہے:

ہمارا ارادہ؟ وہ کیسے؟[۸۶]

جب تحولِ زبان اقتباس میں واقع ہوتا ہے تو بہت واضح ہوتا ہے۔ یہ اقتباس کی تشکیل کے لیے تحولِ زبان کا ایک جانا پہچانا فنکشن ہے۔ ناول کا جائزہ لیتے ہوئے جملے یا فقرے کی سطح تک تحولِ زبان کو پرکھنا ایک مشکل امر ہے جب کہ پوری گفت گو میں تحولِ زبان کا جائزہ لینے کے لیے اگر اقتباس یا تمام مکالمے کا جائزہ لیں تو تحولِ زبان زیادہ واضح ہو گا۔

جیسے کہ اس اقتباس کو دیکھیں:

یہ بات تو سوانح عمری ہو گئی۔ لیکن ہم زبانی کلامی بھی کسی کو اپنی زندگی کا کوئی قصہ سنائیں تو صرف وہی باتیں سنائیں گے جو ہم سنانا چاہتے ہوں گے۔ بہت سی باتیں ہم **اسکپ** کر جائیں گے تاکہ دوسرے ہمارے بارے میں ویسا سوچیں جیسا ہم چاہتے ہیں کہ وہ سوچیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر سامع بھی **ریالٹی** کو اپنے طور پر **ری شیپ** کر رہا ہوتا ہے۔ تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہم سب کسی نہ کسی سطح پر مصنف ہی کا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم **ریالٹی** کو **ایڈٹ** کرتے ہیں، اسے **ری شیپ** کرتے ہیں اور یوں ایک **ایڈیٹڈ ریالٹی** کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔[۸۷]

اسی طرح اب ایک مثال مکالمے سے ملاحظہ کیجیے:

آپ پکا بتائیں کہ آپ نے **مائنڈ** تو نہیں کیا؟" جاوید نے مصافحے کا دورانیہ بڑھانے کے لیے اس سے پوچھا۔

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے بھی خوب سوچ کر جواب دیا۔

جاوید نے "**تھینک یو سو مچ**" کہتے ہوئے اپنی بانہیں اس کے کاندھوں پر پھیلا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"کیا کر رہے ہو؟ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

"بس **شیک ہینڈ، ہگ** وغیرہ تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔"[۸۸]

چوں کہ اقتباسات اور مکالمات میں گفت گو کا تفصیلی جائزہ لیا جا سکتا ہے اس لیے تحولِ زبان کو جانچنا آسان ہے۔ تحولِ زبان کے ذریعے ڈسکورس فنکشن کی دوہری نسبت دیکھی جا سکتی ہے اور صوتی لہجہ بھی **تکرار** کے تعلق سے دیکھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر تکرار (reiteration) سے ڈسکورس افعال کی بیک وقت بڑی تعداد حاصل کی جا سکتی ہے۔

سماجی نفسیاتی اثرات:

تحولِ زبان کے سماجی نفسیاتی پہلوؤں میں باقی پہلوؤں کی نسبت کم کام کیا گیا ہے۔ اگرچہ ماہرینِ سماجی نفسیات کے پیش کردہ تصورات اس کی تفہیم اور نتائج سے تعلق رکھتے ہیں۔ تحولِ زبان دو گروہوں کے درمیان سمجھوتے کا کام کرتا ہے جو متکلموں کی ترجیحی زبان کو قائم کرنے کا طریقہ ہے۔ یعنی دو الگ زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد سمجھوتے کے تحت کسی ایک زبان کا انتخاب کر کے اس میں ہم کلام ہوں گے۔ تحولِ زبان کی مدد سے متکلم اور مخاطب مختلف معنی اور مفاہیم اٹھا سکتے ہیں۔ اس چیز کا کھلا امکان ہے کہ دو متکلموں کے درمیان ان کی اہلیت اور متعلقہ زبان کے مماثلت نہیں پائی جاتی۔ یہ متکلم کو مکالمے میں ایک ہی زبان کے استعمال پر نہیں اکساتا جیسے سیاست دانوں کی

تقاریر میں اردو، پنجابی اور انگریزی ایک ساتھ ملتے ہیں اسی طرح کامیڈین کے لطیفے جن میں وہ پنجابی کی جگتیں بھی کرتے ہیں۔ تحولِ زبان کا استعمال خاص کر میڈیا میں کیا جاتا ہے، جہاں ان کو دیکھنے والے کثیر لسانی لوگ شامل ہوتے ہیں۔

تحولِ زبان کا سب سے اہم فنکشن یہ ہے کہ متکلم مختلف مخاطبوں کے ساتھ ان کی مناسبت سے کسی بھی زبان کا استعمال کرتا ہے۔ مذکورہ ناول میں اقبال محمد خان بھی مخاطب کے مطابق ہی کبھی اردو اور کبھی پنجابی کا استعمال کرتے ہیں۔ تحولِ زبان تعلیم یافتہ پیشہ ورانہ لوگوں پر منحصر ہوتا ہے۔ مختلف پیشوں سے منسلک لوگوں میں تحولِ زبان زیادہ ہوتا ہے۔ تحولِ زبان آہستہ آہستہ ثقافتی، نسلی، موسیقائی، مذہبی اور متعدد سیاق وسباق میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

صنف:

صنف (Gender) سب سے اہم سماجی لسانی پہلو ہے۔ لیکن لسانیات میں مختلف صنفوں کے درمیان یہ مطالعہ تیزی سے ناپید ہو رہا ہے۔ ایک مطالعے کے مطابق عورتیں مردوں کے مقابلے میں معیاری زبان کا استعمال زیادہ اور غیر معیاری زبان کا استعمال کم کرتی ہیں۔ کچھ دوسرے مطالعے دوسرے معاشروں میں مردوں اور عورتوں کے تحولِ زبان کے استعمال کی مقدار اور اقسام کے فرق کو بھی معلوم کرتے ہیں۔[۸۹]

جین ہاسٹ (Jean Haust: 1868- 1946) کے مطابق مرد عورتوں کے مقابلے میں تحولِ زبان دو گنا زیادہ استعمال کرتے ہیں خاص طور پر تقریر و تحریر کے امتیازی اشاروں[۹۰] (discourse markers) کے اندراجات (insertions) میں جیسا کہ لہٰذا، لیکن، پھر، حتیٰ کہ، اس لیے وغیرہ کے استعمال میں خواتین سے دوگنا تحول کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ خواتین کا رجحان اس طرح بار بار الفاظ کی تبدیلی کے بجائے ایک ہی بار زبان کی تبدیلی کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔[۹۱]

ناول میں اگر ہم مردوں اور خواتین کے تحولِ زبان کا جائزہ لیں تو قریباً دونوں میں ایک جیسا ہی استعمال نظر آتا ہے۔ مردوں میں اقبال محمد خان، آفتاب اقبال، جاوید اقبال کے ہاں اور اسی طرح خواتین میں مشعال، عالم گیر اور سلمٰی کے ہاں بھی تحولِ زبان نظر آتا ہے اور حتمی طور پر کسی ایک صنف کے لیے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تحول زیادہ کرتی ہے۔

صنف کوئی مقررہ، مستحکم اور آفاقی زمرہ نہیں ہے جس کے معنی کا ثقافتوں کے اندر یا باہر اشتراک کیا جا سکتا ہے۔ صنف کو معاشرے میں دوسری سماجی شناختوں، دوسرے پہلوؤں اور اس کی مختلف دائرہ اثر[۹۲] (domains)

میں معنی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک غیر ضروری نظریہ صنف کو ایک متحرک ساخت کے طور پر دیکھنا ہے جو تاریخی، ثقافتی، حالاتی اور تعامل کے لحاظ سے تشکیل دیا گیا اور مکالمہ کیا گیا ہو۔

تحولِ زبان سے باقاعدہ طور پر تین فنکشنز وابستہ کیے جاسکتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

- ✓ مزاح کے لیے تحولِ زبان
- ✓ تعلق مستحکم کرنے کے لیے
- ✓ بات سمجھانے کے لیے [۹۳]

مزاح کے لیے تحولِ زبان کا استعمال:

ایسی زبان میں مزاح کا ٹکڑا مکالمے کے ساتھ جوڑنا جو مخاطب کو سمجھ میں نہ آئے۔ پنجابی جگتیں اس کی عام مثال ہیں۔

تعلق مستحکم کرنے کے لیے:

دو گروہوں کے درمیان تعلق مستحکم کرنے کے لیے بھی تحولِ زبان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اقبال محمد خان ،عالم گیر کے ساتھ تعلق مستحکم کرنے ہی کی غرض سے پنجابی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مذہبی انتہا پسندوں کی جماعت جن کا تعلق پشتو زبان سے ہے لیکن چوں کہ ان کی جماعت میں ملک کے مختلف حصوں سے لوگ شامل ہیں لہٰذا وہ تحولِ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی دونوں جماعتوں کے درمیان تعلق مستحکم کرنے کی ایک مثال ہے۔

بات سمجھانے کے لیے:

اگر کوئی بات سمجھ نہ آ رہی ہو تو تب تحولِ زبان کا استعمال کر کے مفہوم واضح کیا جاتا ہے۔ جیسے اوپر آفتاب اقبال کی عالم گیر سے مکالمے کی مثال دی جا چکی ہے۔ تاہم ذیل میں آسانی کے پیشِ نظر پھر پیش کی گئی ہے۔

"دیکھیں، برا نہ منایئے گا۔ میں اپنے ابو کو جانتا ہوں۔ **وہ بہت رومانٹک، میرا مطلب ہے کہ عورتوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔** [۹۴]

خواتین ان اقسام کا زیادہ استعمال کرتی ہیں ان کے مکالمے میں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے حکمت عملی ہوتی ہے۔ تینوں فنکشنز کے درمیان خاص تجاوزات ہیں جو اس خیال کو تقویت دیتے ہیں کہ تحولِ زبان کے ساتھ عمومی شائستگی کا کام وابستہ ہے۔ مختلف وجوہات کے لیے جو ہر معاملے میں بحث کی گئی ہیں یہ سمجھا جاتا ہے کہ تحولِ زبان کا یہ استعمال خاص طور پر معاشرے میں خواتین سے مخصوص ہے۔ حالاں کہ کسی بھی طرح سے یہ ان سے مخصوص نہیں ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ Mode کے لیے اردو اصطلاح "طور" استعمال کی جاتی ہے۔ یہ اصطلاح کشاف اصطلاحات لسانیات میں درج ہے۔ یہ فعل کی گردان میں کام آنے والا ایک تحول ہے جو فعل کے طرزِ عمل یا حالت کو ظاہر کرے۔ اسے Mood بھی کہتے ہیں۔
الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء، ص ۳۱۴۔

۲۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، (نیویارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۶۔

۳۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۲۰ء، ص ۶۶۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔

۶۔ ایضاً، ص ۶۶۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۹۷۔

۸۔ http://www.researchgate.net/publication/229586168_Code_switching_with_English_Types_of_switching_types_of_communities، تاریخ ملاحظہ: ۲۳ فروری ۲۰۲۲ء۔

۹۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۹۷۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۹۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۸۹۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵۵۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۱۷۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۹۴۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۸۴۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۲۶۔

۲۱۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۲۰۔

۲۲۔ https://mandibahauddin.com/mandi-bahauddin/ ، تاریخ ملاحظہ: ۱۱ مارچ ۲۰۲۲ء۔

۲۳۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۲۔

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۱۳۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۴۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۸۹۔

۲۸۔ ایضاً۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۳۴۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۳۹۔

۳۱۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۲۳۔

۳۲۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۳۵۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۴۲۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۲۴۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۵۵۔

۳۷۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۲۴۔

۳۸۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا، ص۶۶۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۴۱۔

۴۰۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۳۰۔

۴۱۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا، ص۸۴۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۴۱۔

۴۳۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۳۱۔

۴۴۔ ایضاً۔

۴۵۔ ایضاً۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۴۔۲۵۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۵۰۔ Integration کے لیے اردو اصطلاح "یکجائی" استعمال ہوتی ہے۔ یہ اجزا کو کل میں منظم کرنے کا عمل ہے۔ اس کل کو اہمیت کے اعتبار سے ترتیب دی جاتی ہے،
الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، ص ۲۵۵۔

۵۱۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۳۱۔

۵۲۔ Morphophonemically کے لیے اردو اصطلاح صرفِ نطقیائی استعمال ہوتی ہے۔ یہ وہ نطقے ہیں جو کسی صرفیے کے مختلف ارکان کے متناظرہ حصوں میں باہم تبدیل ہوتے یا ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں۔
الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، ص ۳۲۱۔

۵۳۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۳۱۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۵۵۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا، ص۲۹۹۔

۵۶۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*،

ص ۳۲۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۵۸۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۱۲۷۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۲۹۹۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۹۶۔

۶۱۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۳۵۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۶۳۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۴۲۔۴۳۔

۶۶۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۷۸۔

۶۷۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۴۵۔

۶۸۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۷۶۔

۶۹۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۴۶۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۷۱۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۵۵۔

۷۲۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۷۴۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۶۵۔۶۶۔

۷۵۔ Index کے لیے اردو اصطلاح "اشاریہ" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ لسانیات میں کسی بولنے والے گروہ، قبیلے یا نسل کی وہ لسانی خصوصیات جو اس گروہ، قبیلے، قوم یا نسل کا پتا دے۔
الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، ص ۲۴۹۔

۷۶۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۶۹۔

۷۷۔ میکسیم معروف فقرے یا کہاوتیں ہیں۔

۷۸۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)،*Code Switching*، ص ۷۱۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۷۲۔

۸۰۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۸۹۔

۸۱۔ ایضاً۔

۸۲۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)،*Code Switching*، ص ۷۲۔

۸۳۔ Transition کے لیے اصطلاح "عبور" استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے ایک حالت سے دوسرے کی جانب تبدیلی۔

الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، ص ۴۶۵۔

۸۴۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۷۴۔۷۵۔

۸۵۔ مافوق الطبیعاتی لسانیات یعنی لسانیات کو وہ شعبہ جو زبان و خیال کے بنیادی اصولوں کا سراغ لگاتا ہے۔

الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، ص ۳۰۹۔

۸۶۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۱۵۔

۸۷۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۸۸۔ ایضاً، ص ۶۳۔

۸۹۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)،*Code Switching*، ص ۸۲۔

۹۰۔ Discourse کے لیے "تقریر و تحریر" اردو اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، ص ۱۷۵۔

۹۱۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)،*Code Switching*، ص ۸۳

۹۲۔ Domain یعنی دائرہ اثر۔ لفظ یا فقرے کا وہ حصہ جہاں تک کوئی خصوصیت اثر انداز ہوتی ہے۔

۹۳۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)،*Code Switching*، ص ۸۵۔

۹۴۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۸۹۔

باب چہارم:

چار درویش اور ایک کچھوا میں تحولِ زبان کے قواعدی اور نفسیاتی لسانیاتی پہلو

باب چہارم:

چار درویش اور ایک کچھوا میں تحولِ زبان کے قواعدی اور نفسیاتی لسانیاتی پہلو

تحولِ زبان کے مطالعے میں ایک ذیلی شعبہ قواعدی نقطۂ نظر کا بھی ہے۔ پچھلے پندرہ سالوں میں سامنے آنے والے مطالعات میں دروں جملوی تحولِ زبان کا قواعدی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا گیا، جس میں مختلف زبانوں کے جوڑے، سماجی ترتیبات اور متکلم کی اقسام شامل ہیں۔ پیٹر موئسکن (Pieter Muysken: 1950-2021)کا کہنا ہے کہ "دو زبانوں سے بنے جملوں میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس حد تک جملے کے نمونے دو زبانوں کے مابین تعامل سے بنتے ہیں۔"[1]

ذیل میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کی گئی ہے:

بچے بہت تھک چکے تھے،

so they took meal and slept.

دو فقروں پر مشتمل یہ جملہ دو زبانوں اردو اور انگریزی زبانوں سے مل کر بنا ہے۔ پہلا حصہ جو اردو زبان میں ہے، مکمل طور پر اردو قواعد جب کہ انگریزی والا جملہ انگریزی قواعد کے مطابق ہے۔ گارڈنر کلوروز کہتی ہیں:

> یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم سب کے پاس اس بحث کا فقدان ہے کہ کیوں اور کیسے قواعد کا تصور تحولِ زبان پر لاگو ہو سکتا ہے۔[2]

پینی لوپ قواعد کے ممکنہ مسائل پر بحث کرتے ہوئے کم سے کم تین طرح کے مسائل[3] کی نشان دہی کرتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

ا۔ قواعد بنیادی طور پر ماہرِ لسانیات کے جملے کی مناسب تشکیل کا بیان ہے جو تجریدی بیان کی نمائندگی کرتا ہے۔ زیادہ تر قواعد کی اقسام میں جملہ بالائی حد کی نمائندگی کرتا ہے لیکن جملہ اور اس کے حصے قواعدی اجزائے کلام کے اسم، فعل، خود ساختہ تقریریں تجزیے کے لیے ضروری طور پر مناسب اکائیاں نہیں ہیں۔ دوسرا یہ کہ قواعدی

نقطہ نظر جملے میں صرف تحولِ زبان کی وضاحت کی کوشش کرتے ہیں تحولِ زبان جملے اور مکالمے کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ ذیل میں جملے اور مکالمے دونوں میں تحولِ زبان کے استعمال کی امثال ناول سے دی گئی ہیں:

جملے میں تحولِ زبان کی مثالیں دیکھیے:

"فی الحال آپ ذرا یہ **کانسیپٹ** سمجھ لیں۔"[۳]

"ضروری نہیں اس **ماڈل** پر میں خود بھی یقین رکھوں۔"[۴]

"آپ کی **فنگرز** بہت پیاری ہیں۔ بلکہ سارا ہاتھ ہی۔ کافی **گرلش** ہے آپ کا ہاتھ۔"[۵]

"**نئیں** سر جی، عالم گیر تو کوئی نہیں رہتا"۔[۶]

"یہ تمھارا ارادہ ہی ہے جو تمھیں اپنے بس میں کر لیتا ہے اور تم **الصلوۃ خیر من النوم** کی صدا سننے کے باوجود اپنے بستر میں دبکے رہتے ہو۔"[۷]

ناول سے لیے گئے ان چند جملوں میں اردو جملوں میں انگریزی الفاظ "کانسیپٹ"، "ماڈل"، "فنگرز"، "گرلش" اور پنجابی لفظ "نئیں" کا تحول استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آخری مثال میں اردو جملے میں "**الصلوۃ خیر من النوم**" کا عربی فقرہ شامل کیا گیا ہے۔

مکالمے میں تحولِ زبان کی مثال ملاحظہ کیجیے:

- Kal tum bhool tou nahi jao gi na?
- Kya?
- That you have agreed?
- Ok baba. Ok
- Now go to sleep.
- Tou kya nahi bhoolo gi?[۸]

درج بالا مکالمے میں اردو اور انگریزی کا تحول شامل ہے۔

۲۔ قواعدی تحولِ زبان میں زیادہ تر ادب میں منظم طریقے سے استعمال ہونے والے کلیدی تصور کے بارے میں شبہات پائے جاتے ہیں یعنی بیس یا قالبی زبان۔ قالبی زبان کے کردار پر غلط یقین بہت سی قواعدی تجاویز کی ناکامی کو مکمل طور پر بیان کرنے کے لیے تحولِ زبان کے مواد کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ یعنی تحولِ زبان کی حامل گفت گو کا تجزیہ

کرنے کے بعد قالبی زبان اور تحول والی زبان میں تمیز کی جاتی ہے اور پھر گفت گو سے متعلق قواعدی تجاویز فراہم کی جاتی ہیں۔

۳۔ تحولِ زبان پر زیادہ تر کام ایک مفروضے پر مبنی ہے کہ دو زبانیں دو معنی خیز طریقوں سے واضح طور پر ممتاز قواعد کے درمیان تبدیل ہوتی ہیں لیکن یہ ایسا سوال نہیں ہے کہ جس کا فیصلہ صرف قواعدی تجربے سے کیا جا سکے۔[۹]

جیسے:

"جی امی، انگریزوں نے بھی **میٹا فزیکل فینامینا** پر کتابوں کا ایک طومار کھڑا کر رکھا ہے۔"[۱۰]

درج بالا جملے میں اردو ساخت کے مطابق تابع فعل یعنی "میٹا فزیکل فینامینا" کا استعمال جملے کے وسط میں کیا جا رہا ہے، جب کہ انگریزی قاعدے میں یہ جملے کے آخر میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم اس بات کو اوپر بیان کیے گئے نکتے کے مطابق یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو اور انگریزی زبانیں جملے میں ممتاز قاعدے کے مطابق تبدیل ہوئی ہیں۔

یک لسانیت کی بنیاد پر تحولِ زبان کی رکاوٹوں اور تحولِ زبان کی قواعد کے وجود کی حمایت یا اختلاف میں یقین دہانی کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔

پینی لوپ مزید لکھتی ہیں کہ تحقیق کو پہلے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ

الف۔ تحولِ زبان کا استعمال کرنے والے متکلم دو یا زائد قابلِ شناخت زبانیں رکھتے ہوں۔ جن میں سے ہر زبان کی اپنی لغت اور اصول ہوں۔

ب۔ تحولِ زبان کی حامل گفت گو ان زبانوں کے لغوی عناصر اور قواعدی اصولوں کے مابین متوقع تعامل کے نتیجے میں ہوتی ہے۔[۱۱]

تحولِ زبان پر قواعدی نظریات کے اطلاق پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم قواعدی نظریات کی ان اقسام کو جان لیں۔ تحقیق میں قواعد کی استعمال ہونے والی اصطلاح کی چار اقسام ہیں:

۱۔ تقعیدی[۱۲] (Prescriptive)

۲۔ آفاقی (Universal)

۳۔ رسمی (Formal/ Generative)

۴۔ وظیفوی[۱۳] (Functional)[۱۴]

۱۔ تقعیدی قواعد:

تحولِ زبان کے قواعد پر کام کرنے والے ماہرینِ لسانیات ذو لسانی کلام کے تقعیدی نمونے شعوری طور پر آگے نہیں بڑھاتے بلکہ زیرِ نظر آفاقی باقاعدگی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تحولِ زبان کے قواعد کی تحصیص کا یہ نتیجہ ہے کہ تحولِ زبان کے استعمال کا صحیح اور غلط یا کم از کم ایک ممکن اور نا ممکن طریقہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس قسم میں قواعد کا خاص دھیان نہیں رکھا جاتا۔ عام بول چال ہوتی ہے، لکھنے بولنے میں قواعد پر توجہ نہیں دی جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ مختلف اقسام سے لیے گئے الفاظ کا مجموعہ تحولِ زبان نہیں ہوتا۔ جیسے:

"کتب خانہ" جو کہ عربی فارسی ترکیب ہے۔ یہ تحولِ زبان کے ذیل میں نہیں آتی۔ اسی طرح اردو میں رائج کئی اردو۔ فارسی، عربی۔ فارسی اور عربی۔ اردو تراکیب تحولِ زبان نہیں کہلائیں گی۔

بہت سے قواعدی نقطۂ نظر مختلف ذیلی گروہوں میں رائج چیزوں کے درمیان تغیرات کے ساتھ شامل نہیں ہوتے، جیسا کہ مختلف پودیں یا مختلف سیاق میں ایک ہی متکلموں کا گروہ۔ غیر مرکوز سیاق وسباق کی حامل گفت گو پر قواعد کے ان منظم اصولوں کو لاگو نہیں کیا جاسکتا، جو معیاری تحریروں اور تقریروں پر لاگو ہوتے ہیں۔

۲۔ آفاقی قواعد:

آفاقی قواعد درحقیقت قواعد نہیں ہیں بلکہ یہ قواعد کی نقل ہیں۔ اس کے مطابق انفرادی قواعد کے اصول اپنائے جاسکتے ہیں۔ جوں جوں ترقی ہو رہی ہے آفاقی قواعد میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ آفاقی قواعد، چومسکی کی قواعد بھی کہلاتی ہے۔ چومسکی E Languageاور I Language کے درمیان امتیاز کی وضاحت کرتا ہے۔ E Language معاشرے میں پائی جانے والی گفت گو ہے، جب کہ I Language افراد کے ذہن میں موجود اجزا ہیں جو کسی زبان کو جانتے ہیں۔ اس کے مطابق تحولِ زبان نا خالص ہے اور کسی بھی انتخاب کی نمائندگی نہیں کرتا۔ جیسے کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنی زبان کے علاوہ کسی نہ کسی زبان کو سمجھنے کی حد تک پہچانتا ہے گو کہ وہ زبان بول سکتا ہو یا نہ بول سکتا ہو۔ معاشرے میں گفت گو کے لیے منتخب کی جانے والی زبان E Language کہلائے گی۔ عموماً یہ اشرافیہ یا اقتدار کی زبان ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں "اردو زبان" E Language کہلائے گی، جب کہ باقی مادری زبانیں I Language کے ذیل میں آئیں گی۔ ناول میں پنجابی، پشتو اور پوٹھوہاری زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ زبانیں I Language کہلائیں گی، جب کہ اردو اور انگریزی E Language کہلائیں گی۔

جارج لیکاف (George Lakoff:1941) نفسیاتی قواعد بیان کرتا ہے، جس کے مطابق دیکھا جاتا ہے کہ متکلم قواعد کے بارے میں کیا جانتا ہے اور اس فہم کو کیسے ظاہر کرتا ہے؟ یعنی قواعد کا علم رکھتے ہوئے متکلم اس کا اطلاق کیسے کرتا ہے اور روزمرہ بول چال میں کس حد تک وہ قواعد کا خیال رکھتا ہے؟

۳۔ رسمی قواعد:

رسمی قواعد تخلیقی قواعد ہے۔ جس کا اظہار عام طور پر پیچیدہ محاورے کی ساخت کی بنت میں کیا جاتا ہے۔ پینی لوپ گارڈنر بتاتی ہیں کہ قووی (Cowit) کے مطابق رسمی کلامیے میں اصطلاح "قواعد" تین نمایاں نکات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے:

۱۔ دی گئی زبان میں اچھے سے تشکیل شدہ زنجیرہ[۱۵] (Strings) کا تعین کرنے والی قواعدی زبان۔

۲۔ قابلیتی (competence) قواعد جو قواعد وضوابط کے مجموعے پر مشتمل ہوتی ہے اور متکلم کے ذہن میں موجود ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

۳۔ ماہرینِ زبان کا قواعدی ماڈل۔

ماہرینِ زبان کا قواعدی ماڈل اور ذہن میں موجود قواعد کا مواد بالواسطہ طور پر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں۔ یعنی متکلم کے ذہن میں موجود کسی بھی زبان کے قواعد کے مطابق ہی ماہرینِ زبان کوئی قواعدی نمونہ تشکیل دیتے ہیں۔

۴۔ وظیفوی قواعد:

وظیفوی قواعد میں دو زبانوں کے قواعد کو ملا دیا جاتا ہے۔ جیسے:

"۔۔۔زوجۃ حسنۃ وجمیلہ۔۔۔جنت کی حسین لڑکیاں۔"[۱۶]

"سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ومن الناس من یشریٰ نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔ واللہ رؤف بالعباد۔ تم میں سے کون ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لیے خود کو بیچ دے۔"[۱۷]

درج بالا متن میں اردو اور عربی کو ان کے قاعدے کے مطابق استعمال کیا گیا ہے اور ایک ہی متن میں دونوں زبانوں کے قواعد ملا دیے گئے ہیں۔

وظیفوی قواعد سے متعلقہ اطلاقی ڈھانچوں کے جھرمٹ کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ قواعد و نحو، معنی و مفہوم اور تفاعلی کلامیے کے درمیان سخت تقسیم کو نہیں پہچانا جا سکتا۔ اس کے لیے قابلی زبان کے تصور پر انحصار کیا جاتا ہے۔ تحولِ زبان کے قواعدی مطالعہ کی بنیاد قواعد کی دوسری اور تیسری اقسام پر ہے۔

قواعدی ماڈل کے تحولِ زبان پر اطلاق کے مطالعے میں تین اہم رجحانات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

۱۔ تغیر پذیر نقطۂ نظر (Variationist approach)

۲۔ پیداواری نقطۂ نظر (Generativist approach)

۳۔ تخلیقی نقطۂ نظر (Productive approach)[۱۸]

تغیر پذیر نقطۂ نظر:

تغیر پذیر نقطۂ نظر پوپ لیک (Poplack)، سینکاف (Sankoff) اور ٹم (Timm) نے پیش کیا، جو ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان وجود میں آیا تھا۔ جب قواعد بنانے کی مختلف کاوشیں کی گئیں، جو عالمی رکاوٹوں پر مبنی تھیں جہاں تحولِ زبان جملے میں ہو سکتا تھا۔ جب پہلی دفعہ تحولِ زبان کا قواعدی سطح پر مطالعہ کیا گیا تو یہ مشاہدہ سامنے آیا کہ جملے میں بعض اوقات تحولِ زبان کئی مقامات پر واقع نہیں بھی ہوتا۔ کچھ قسم کے تحول جیسے لغوی منتقلی بعض معاشروں میں جیسا کہ ہسپانوی زبان بولنے والوں میں عام تھی، اسی طرح اسم ضمیر اور فعل کے درمیان منتقلی بہت کم تھی۔ لغوی منتقلی اب بھی مشاہدہ کی جاتی ہے۔

ذیل میں لغوی منتقلی کی اقسام دی گئی ہیں:

"ابو کو جوانی میں شاعری سے دل چسپی تھی، وہ دونوں مل کر کوئی لٹریری ایکٹویٹی کر سکتے تھے۔"[۱۹]

"آپ کو پتا ہے کہ آپ جس انگریزی اخبار میں لکھتے ہیں اس کی پبلی کیشن کتنی ہے؟"[۲۰]

"سلطانہ میں سیکس کا آدمی نہیں ہوں۔ محبت کا آدمی ہوں۔"[۲۱]

درج بالا جملوں میں لغوی منتقلی کی چند مثالیں ناول سے دی گئی ہیں۔ اور ان امثال کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے۔ روز مرہ زندگی میں ہم تواتر سے لغوی منتقلی کرتے رہتے ہیں۔

ان تحقیقات کہ بعد کچھ محققین جیسا کہ جوشی اور ٹم خاص کر پوپ لیک نے یہ آرا پیش کیں کہ جملے میں کچھ آفاقی نوعیت کی رکاوٹیں ہونی چاہیے جہاں تحول واقع ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ان کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔[۲۲]

محدود (لفظ)[۲۳] رکاوٹیں (The Clitic Constraints):

"محدود رکاوٹوں" میں محدود فاعل یا اسم ضمیر ایک ہی زبان میں فعل کے طور پر محسوس کیے جانے چاہیے۔ یعنی ان کے دائیں یا بائیں بالواسطہ فعل کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا بعض اوقات ان کے درمیان محدود الفاظ بھی آ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل جملے دیکھیے:

آپ نے ریالٹی کا ایک پورشن چنا اور اس کی تصویر اتار لی۔[۲۴]

اس کا عقل چوٹا ہوتا ہے۔[۲۵]

ان امثال میں محدود الفاظ جیسا کہ "نے، کی اور کا" استعمال ہوئے ہیں۔

کھلاوا[۲۶] مارفیم رکاوٹیں:(The Open Morpheme Constraints)

یہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ آزاد اور پابند۔

پابند مارفیم اور لغوی شکل کے درمیان تحول منع ہے یعنی کہ لفظ کا مادہ ایک زبان کا اور پابند مارفیم دوسری زبان کا۔ لیکن یہ صورت کئی زبانوں میں نظر آتی ہے کہ ایک زبان کے الفاظ کے ساتھ دوسری زبان کے سابقے لاحقے لگا دیے جاتے ہیں جیسے کہ:

تخلیق کار واقعی اپنے اندر کے آئینے میں حقیقت کوری شیپ کر رہا ہوتا ہے۔[۲۷]

"تقلیب۔ منقلب۔ تبدیل کرنا۔ **ری شیپنگ**۔ ری ماڈلنگ۔ ری ڈیزائنگ۔ **ری رگنائزیشن**۔"[۲۸]

میں تو کوئی گھس بیٹھیا ہوں جو اپنے ہی ملک میں **نامطلوب** ہے۔[۲۹]

درج بالا امثال میں ایسے الفاظ کی نشان دہی کر دی گئی ہے جن کا مادہ ایک الگ زبان سے لیا گیا ہے اور ساتھ دوسری زبان کا پابند مارفیم جوڑا گیا ہے۔

پہلی مثال میں "تخلیق" کی اصل عربی ہے، جب کہ ساتھ "کار" کا پابند مارفیم یعنی لاحقہ فارسی زبان سے لیا گیا ہے۔ دوسری مثال میں دو الفاظ خط کشیدہ کیے گئے ہیں۔ "ری شیپنگ" اور "ری آرگنائزیشن" میں سابقہ "ری" لاطینی زبان سے لیا گیا ہے، جب کہ "شیپنگ" اور "آرگنائزیشن" کی اصل بالترتیب انگریزی اور یونانی ہے۔ تیسری مثال میں "نامطلوب" میں "نا" کا سابقہ سنسکرت زبان سے لیا گیا ہے، جب کہ "مطلوب" کی اصل عربی ہے۔

یہ وضع کردہ صورتیں چسپیدہ اور غیر چسپیدہ دونوں زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ کچھ معاشروں میں یہ تحول کی عام صورتوں میں سے ایک ہے۔

مترادف رکاوٹیں:(The Equivalence Constraints)

پوپ لیک اور دیگر ماہرین نے یہ رائے پیش کی کہ جہاں دو زبانوں کی سطحی ساخت پر فرق ہو وہاں تحولِ زبان واقع نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس تعریف کے باوجود ہمیں تحولِ زبان کی یہ صورت متعدد مقامات پر اصول کی خلاف ورزی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جیسے:

"ہیلو سر، میں ہوں، میں۔۔۔ سلمٰی۔۔۔ آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا ناں سر۔"[۳۰]

"دیکھو میری لائف اب ویسی کمفرٹ ایبل نہیں رہی۔"[۳۱]

"۔۔۔ اور تم الصلوٰۃ خیر من النوم کی صدا سننے کے باوجود اپنے بستر میں دبکے رہتے ہو۔"[۳۲]

درج بالا امثال میں سے پہلی دو امثال میں انگریزی اور اردو کا امتزاج دکھایا گیا ہے کہ قواعدی ساخت کے الگ ہونے کے باوجود تحول واقع ہوا ہے۔ اسی طرح تیسری مثال میں عربی اور اردو کے درمیان تحول دکھایا گیا ہے کہ ان دونوں زبانوں کی سطحی ساخت میں فرق ہے لیکن تحول واقع ہوا ہے۔

مترادفات کا یہ تصور بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے۔ رومینی سوزین کہتی ہیں کہ مترادف رکاٹیں یہ مانتی ہیں کہ رابطے میں دو زبانیں ایک ہی زمرے کا اشتراک کرتی ہیں اور جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں زبانوں کے امتزاج سے متعلق پیش گوئیاں نہیں کی جاتیں۔

درج بالا رکاوٹوں میں سے کوئی بھی رکاوٹ زبانوں کے امتزاج یا معاشروں کے جدید مطالعے میں سامنے نہیں آئیں۔ ان تمام رکاوٹوں کی خلاف ورزی کے ضمن میں پوپ لیک کا کہنا ہے کہ یہ خلاف ورزی اس لیے ہوئی ہے کیوں کہ ہم تحولِ زبان نہیں کر رہے تھے بلکہ الفاظ کو دوسری زبانوں سے مستعار لے رہے تھے۔

پیداواری نقطۂ نظر:

یہ نقطۂ نظر ۱۹۸۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ذیل میں اس کے کچھ نکات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ا۔ متابعت:(Government)

پیداواری نقطۂ نظر سنگھ (Singh)، جوشی (Joshi) اور دیگر ماہرین نے پیش کیا۔ اس میں متابعت کے لحاظ سے تحولِ زبان پر رکاوٹوں کی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے۔ عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ منتظم (governor) اور زیرِ منتظم (governed) عناصر کے درمیان تحول نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ نظریہ بہت سی عام منتقلیوں کے حساب سے ناکام ہو جاتا ہے۔ جیسے فعل اور متعلق فعل اسی طرح اسم اور فعل کے درمیان۔

"نہیں، وہ ہاف سلیوز کے ساتھ پہنتی ہوں۔"[۳۳]

"استاذ، سرکٹ ٹوٹ گیا ہے۔"[۳۴]

"۔۔۔سوسائٹی کو اس سے زیادہ فائدہ ہو رہا ہوتا۔۔۔"[۳۵]

"وہ گن پوائنٹ پر چھن گیا۔"[۳۶]

پہلی اور چوتھی مثال میں فعل اور متعلق فعل کے درمیان تحول ہوا ہے، جب کہ دوسری اور تیسری مثال میں اسم اور فعل کے درمیان تحول ہوا ہے۔

ب۔ منسوخ کرنا:(To Cancel)

تحولِ زبان کے علاوہ کوئی چیز بھی مخلوط گرامر میں رکاوٹ نہیں ہے۔ اس میں تفاعلی مرکز یعنی functional head ایک زبان میں اور تبصرہ (compliment) دوسری زبان میں کیا جاتا ہے۔ جیسے:

ڈڈیو مائنڈ اگر میں ابو کی ڈرنکس میں سے کچھ ٹرائی کر لوں؟"[۳۷]

"میں صرف تمھیں بتا رہا تھا کہ یو ہیو ٹو ریمین آن گارڈ۔"[۳۸]

"بٹ آئی نو کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔"[۳۹]

"سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ومن الناس من یشریٰ نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔"[۴۰]

درج بالا امثال میں پہلی اور تیسری مثال میں جملے کا انگریزی والا حصہ تفاعلی مرکز ہے اور اردو والا حصہ تبصرہ کہلائے گا۔ دوسری مثال میں پہلا حصہ اردو زبان میں کہا گیا ہے یہ تفاعلی مرکز ہے اور اگلا انگریزی والا حصہ تبصرہ ہے۔ اسی طرح چوتھی مثال کو دیکھیں تو پہلا حصہ اردو میں کہا گیا ہے یہ تفاعلی مرکز ہے جب کہ اگلا حصہ جو عربی زبان میں کہا گیا ہے وہ تبصرہ ہے۔

تخلیقی نقطۂ نظر:

یہ نقطۂ نظر تحولِ زبان کے نفسیاتی لسانی پہلوؤں سے نمٹنے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ تحولِ زبان میں ایک فریم یا قالب (matrix) ملوث ہوتا ہے، جس میں دوسری زبان کے عناصر سرایت کر سکتے ہیں۔ اس نظریے کی ترویج میں مائرس اسکاٹن اور اس کے ساتھیوں نے ایک قواعدی ماڈل ترتیب دیا، جو Matrix Language Frame کہلاتا ہے یہ درجہ بندی کا فریم ورک فراہم کرنے اور مجوزہ معاہدے میں رکاوٹوں کو باندھنے میں پچھلی رکاوٹوں سے اس طرح مختلف ہے:

الف۔ تحولِ زبان میں مارفیم کی مختلف اقسام کا کردار: تمام تحولِ زبان میں ایک غالب زبان ہوتی ہے جو قالبی زبان یا بنیاد ہے۔ یہ جملے میں مارفیمی نظام یعنی بند مارفیم (closed class words) مہیا کرتی ہے، جب کہ سرایت شدہ زبان (embedded language) مارفیمی مواد کا تناسب یعنی کھلا وامارفیم (open class morpheme) مہیا کرتی ہے۔ جیسے:

بند مارفیم کی مثالیں:

"ضروری نہیں کہ اس ماڈل پر میں خود بھی یقین رکھوں۔"[۴۱]

"یہ اتنا سارا گلیمر جو آپ ٹی وی پر دکھا رہے ہیں۔۔۔"[۴۲]

درج بالا ناول سے لی گئی امثال میں بند مارفیم کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے۔

کھلا وامار فیم کی مثالیں:

"چلو آج سے ہم تم فرینڈز۔"[۴۳]

"نہیں مردوں میں ڈفرنٹ ہی ہوتی ہے۔"[۴۴]

"شہر بھی اب فطرت یعنی لارجر فطرت کا حصہ ہیں۔"[۴۵]

ان امثال میں کھلا وامار فیم کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے۔

ب۔ نفسیاتی لسانیاتی تصور کی فعالیت

اس کا ذکر آگے زبان کے نفسیاتی لسانیاتی مباحث میں کیا جائے گا۔

اوپر بیان کی گئی قواعد کی کسی بھی قسم سے یہ قواعد مماثل نہیں ہے۔

پیٹر میکسن (Peter Macswan: 1950) تحولِ زبان کے مختلف اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔[۴۶] ان کا کہنا ہے کہ اگر زبانوں کے ملاپ کی راہ میں یہ اصول حائل ہوں یا تحولِ زبان کے اصولوں کے اطلاق میں مسئلہ ہو تو تھوڑی سی تبدیلی سے انھیں اپنالینا چاہیے۔

زبان کے عمل میں ایک فریم کی تعمیر شامل ہے، جو عام طور پر دو زبانوں میں سے کسی ایک کے ذریعے طے کیا جاتا ہے جس میں دوسری زبان کے عناصر شامل کیے جاتے ہیں۔ اردو میں انگریزی، فارسی اور عربی کے متعدد الفاظ اور تراکیب شامل کر لیے گئے ہیں۔ اس طرح ہمارے معاشرے میں بھی مادری زبانوں کے اندر بھی کچھ اردو اور انگریزی کے الفاظ ایسے سرایت کر گئے ہیں کہ اب وہ انھی زبانوں کا حصہ معلوم ہونے لگے ہیں۔

یہ ماڈل رکاوٹوں سے مجسم تبدل(alternational) نقطۂ نظر کے برخلاف اندراجی (insertional) ہے۔ قواعدی سطح پر یہ ایک مرکوز فریم ورک ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ تحول زبان اخراج (attrition) اور منتقلی کے دوران واقع ہوتا ہے، جب متکلم کی قالبی زبان کے صرفِ نحویاتی[۴۷] (Morphosyntactic) فریم تک رسائی نہیں ہوتی یا جب ہدفی قالبی زبان کا تصور خود بولنے والوں پر واضح نہیں ہوتا، یہ ایک حیران کن بیان ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قالبی زبان کا استعمال تخلیق کا ضروری پہلو ہونے کے بجائے فرد کی تعلیم یا اہلیت سے جڑا ہوا ہے۔ قالبی زبان کا تعین مقداری کسوٹی کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس کسوٹی کے مطابق بہت سی ذولسانی گفت گو قالبی زبان کے کئی بار تبدیل ہونے کی وجہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ قالبی زبان کے تجزیے سے مارفیم کی تعداد کی مدد سے مختلف جملوں کے تعامل کا پتا چلایا جاتا ہے۔ کچھ مارفیم کی پہچان مشکل ہوتی ہے کیوں کہ وہ غیر رائج ہوتے ہیں۔

قالبی زبان کئی خصوصیات کی حامل ہوتے ہوئے ان طریقوں میں قابلِ شناخت ہے۔[۴۸]

الف۔ **نفسیاتی لسانیات** قابلی زبان دماغ میں بہت زیادہ فعال ہوتی ہے۔ تاہم یہ غیر واضح ہے کہ اس کا آزادانہ مظاہرہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ دماغ میں موجود فعال زبان اور جملے کے قواعدی ڈھانچے کے درمیان رابطہ زیادہ واضح نہیں ہے۔ متکلم نے گفت گو کے لیے اپنے ذہن میں موجود فعال زبان کا استعمال کرنا ہے اور اس دوران وہ ان جانے میں دوسری زبانوں میں تحول بھی کر تا رہے گا۔ ناول کے کرداروں کے مکالموں پر بات کریں تو اقبال محمد خان پنجابی زبان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چوں کہ ان کے ذہن میں اردو زبان زیادہ فعال ہے۔ ضرورت کے پیش نظر وہ پنجابی کا استعمال بھی کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ عالم گیر کے ساتھ ان کے متعدد مکالمات پنجابی میں بھی ہیں۔ ذیل میں چند بیان کیے گئے ہیں:

"پیو داناں نئیں پچھیا، تیرا پچھیا اے۔"[۴۹]

(باپ کا نام نہیں پوچھا، تمھارا پوچھا ہے)

"ایہہ کھالے۔ تے کسے نوں ناں دسیں۔"[۵۰]

(یہ کھالو۔ اور کسی کو نہ بتانا)

ب۔ **سماجی** قابلی زبان معاشرے میں کلام کے غیر نشان زدہ انتخاب کو ظاہر کرتی ہے۔ اوور کا کہنا ہے کہ یہ معیار کسی گروہ میں لسانی انتخاب میں زیادہ رکاوٹیں ہوتی ہیں یکساں مکالے کو سمجھتا ہے۔ بہت سے معاملات میں جہاں دو یا زائد زبانوں کا استعمال کرنے پر کوئی سماجی دباؤ نہ ہو وہاں زبان کی تبدیلی (alteration) تقریر و تحریر کے عوامل سے متعلق ہوتی ہے۔ ناول کے اندر تمام کردار اپنے اپنے مکالمات کے لیے آزاد ہیں۔ اپنی گفت گو کے اندر ان کا ایک سے دوسری زبانوں میں تحول متکلم کا اپنا ذاتی انتخاب ہے۔

موئسکن تحولِ زبان کے مقابلے میں ادغام زبان کی اصطلاح کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ موخر الذکر کو تبدیلی کے مترادف کے طور پر استعمال کرتے ہوئے درج ذیل اقسام میں امتیاز کرتے ہیں۔[۵۱]

ردوبدل:(Alternation)

یہ تب واقع ہوتی ہے، جب دو قواعد میں مطابقت ہوتی ہے یا کم سے کم جہاں تحول واقع ہو رہا ہو وہاں برابری ہو۔ اقبال محمد خان کا عالم گیر سے دوسری ملاقات میں اردو زبان میں مخاطب ہونا:

"کتنے بچے ہیں تمھارے؟"

لیکن عالم گیر کا پنجابی میں جواب دینا:

"ہک ای ہے جی۔ دو دھیاں ہور آہیاں۔ ہک پر مر گئی، ہک پر ار"[۵۲]

(ایک ہی ہے جی۔ دو بیٹیاں اور تھیں۔ ایک پچھلے سال مر گئی اور ایک اس سے پچھلے سال)

اس گفت گو میں استعمال ہونے والی دونوں زبانیں یعنی پنجابی اور اردو ایک دوسرے سے ساختی طور پر مطابقت رکھتی ہیں۔

اندراج: (Insertion)

دوسری قسم اندراج کی ہے جو مستعاریت کا مترادف عمل ہے لیکن اس میں مفرد لفظ کے بجائے مرکب عناصر داخل کیے جاتے ہیں۔

"سر میں بہت درد ہو رہی تھی۔ سلیپنگ پل لے کر سو یا تھا۔۔۔"[۵۳]

نہیں، یہاں سے یہ پہاڑ بیک گراؤنڈ میں پورا نہیں آ رہا۔۔۔"[۵۴]

ان کی جی ڈی پی گرو تھ جتنی مرضی ہو جائی، یہ مغرب سے نیچے ہی رہیں گے۔"[۵۵]

درج بالا امثال میں ناول سے چند مثالیں لی گئی ہیں جن میں انگریزی کی تراکیب کا اردو جملوں میں اندراج کیا گیا ہے۔

اندراجی ادغام زبان میں ایک زبان زیادہ فعال رہتی ہے جو اصل فعل اور فنکشنل عناصر کو زبان مہیا کرتی ہے۔ جیسا کہ اردو زبان اوپر دی گئی مثالوں میں زیادہ فعال ہے۔

متطابق لغویت[۵۶](Congruent Lexicalization) :

یہ تیسرا طریقہ ہے جس میں زبان قواعدی ساخت کی شراکت کرتی ہے۔ لیکن ذخیرۂ الفاظ دو یا تین زبانوں سے آتا ہے۔ اس قسم کے ادغام زبان میں مخلوط زبانوں سے یک لسانی کی نوعیت کا تعین کیا جاتا ہے۔

ناول میں متعدد مقامات پر ہمیں ایسی امثال ملتی ہیں جہاں اردو اور انگریزی نیز اردو اور عربی کی قواعدی ساختوں کا امتزاج ملتا ہے۔ جیسے:

"استاذ، سرکٹ ٹوٹ گیا تھا۔"[۵۷]

صفدر باہر لے ملخ میں سٹیزن شپ کے چکر میں ہے، جس کے لیے گوری میم کو پھنسانا پڑتا ہے۔"[۵۸]

پہلا جملہ اردو اور عربی کا امتزاج ہے، اس میں اردو، انگریزی اور پنجابی سے ذخیرۂ الفاظ آیا ہے۔ دوسرا جملہ پنجابی اور اردو کا امتزاج ہے۔ اس جملے میں اردو، پنجابی اور انگریزی سے ذخیرۂ الفاظ آیا ہے۔ ان تمام الفاظ کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے۔

ادغامِ زبان کی تینوں اقسام مختلف لسانی، سماجی لسانی اور نفسیاتی لسانی عوامل سے وابستہ ہیں۔ ردوبدل مستحکم ذولسانی صورت حال میں ہونے کا امکان ہے۔ ذولسانی دماغوں میں زبانیں فعال ہوتی ہیں۔ اندراج ایسے حالات میں پایا جاتا ہے جہاں ذولسانی مہارت غیر متناسب ہو۔ قریبی متعلقہ زبانوں کے درمیان متطابق لغویت پائی جاتی ہے جہاں ان کا نسبتی وقار قریباً برابر ہو یا جہاں کھلم کھلا زبان کی علاحدگی کی روایت نہ ہو۔ موئسکن ادغامِ زبان کی درج بالا تینوں اقسام کو تکونی شکل میں بیان کرتے ہیں۔

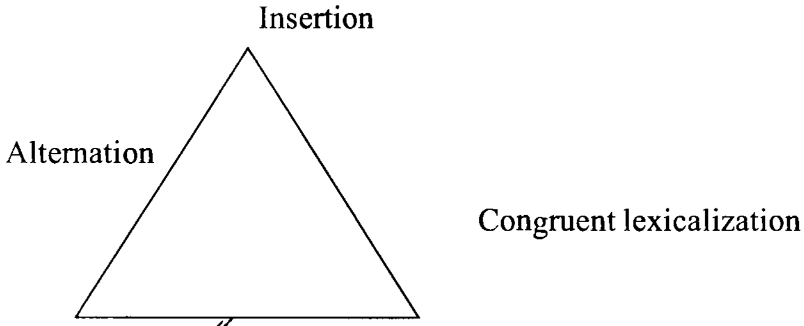

تحولِ زبان کی اقسام اور سماجی لسانی حالات کے درمیان موئسکن کے مجوزہ باہمی تعلقات کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہمیں ممکنہ طور پر قابلِ جانچ تصورات کا ایک مجموعہ فراہم کرتے ہیں۔ اگرچہ قواعد کے لحاظ سے ادغامِ زبان کو بیان کیا جاسکتا ہے جو اسے ایک مقررہ تناظر میں بیان کرتے ہیں۔[59]

مجموعی طور پر ہمیں ایک حد تک تغیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موئسکن کا کہنا ہے کہ دونوں رکاوٹیں اور قابلِ زبان تحولِ زبان کی اکثر اقسام سے متعلقہ ہیں۔ اس سے دوبارہ یہ بحث شروع ہو جاتی ہے کہ قواعد وضاحت کا صرف ایک حصہ فراہم کرسکتی ہے جیسا کہ تحولِ زبان وہ قسم کیوں لیتی ہے جو یہ استعمال کرتی ہے۔

گارڈنر کلوروز پیری مین کے تشخیص کردہ ادغام کی اقسام کی فہرست پیش کرتی ہیں جس میں الفاظ کا ادغام، مادہ اور لاحقے کا ادغام، صوت رکن کی آمیزش، ایک زبان کے نحو دوسری زبان کی لغت کے ساتھ یا ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان کے صوت کے ساتھ تلفظ کیے جانا شامل ہے۔ پیری مین نے ادغام کی ان اقسام میں سے ہر ایک سے متعلقہ تجاویز دیں۔ یہ چاروں مراحل بہ ترتیب یوں ہیں:

۱۔ پیغام کی سطح پر قائم تصوراتی تعلقات

۲۔ تفاعلی سطح پر جملے سے متعلقہ الفاظ کا چناؤ

۳۔ پوزیشن کی سطح پر بند درجہ الفاظ کا چناؤ اور تفویض کردہ صوتیاتی شکل

۴۔ صوتیاتی سطح پر بیان کردہ الفاظ کی صوتی شکل [۱۰]

تحولِ زبان کی مختلف اقسام زبانوں اور مختلف سماجی لسانی حالات کے درمیان لسانی قربت کے مختلف درجوں کے تناظر میں پائی جاتی ہیں، پھر ان عوامل کے نسبتی تعاون کا جائزہ لینے کا طریقہ تلاش کرنا ترجیح ہے۔ ایسے ٹکڑے جو ذہن میں اکیلے با معنی پائے جاتے ہوں وہ بھی قابلِ منتقل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ انگریزی حرف "The"۔ یہ جاپانی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ پیغام پہنچانا ہوتا ہے کہ The منفرد اور بے مثال حوالہ ہے۔ اس قسم کی مثال قواعد پر انحصار کرنے والی وضاحتوں کی عدم دست یابی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اردو اور انگریزی میں استعمال ہونے والا "ہاہاہا۔۔۔" اور اسی طرح "اوہ" اور دوسری بے ساختہ آوازیں۔

اب اگر ہم زبان کے نفسیاتی لسانیاتی پہلوؤں کو دیکھیں تو اس پر لسانیات میں کم کام ملتا ہے لیکن ذیل میں کچھ مباحث سے وضاحت ملتی ہے۔

زبان کیا ہے؟ نفسیاتی لسانی عوامل کو سمجھنے کے لیے یہ سوال نہایت اہم ہے۔ اگر ہم لسانی مواد کے عمل (processing)، خطِ رمز شناسی (decoding)، ذخیرہ اندوزی (storage)، بازیافت (retrieval) اور لسانی مادے کی تخلیق کے طریقے کو سمجھ لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا دیگر علمی شعبوں سے کیا تعلق ہے؟ ان میں سے کسی بھی پہلو کے حوالے سے ذو لسانی فنکشن کسی نہ کسی مادی انداز میں یک لسانی گروہوں سے مختلف ہے، پھر اس فرق کو ذو لسانی تقریر کے پہلوؤں سے جوڑنے کی بنیاد ہو سکتی ہے مثال کے طور پر اس خیال کی تصدیق یا تردید کے لیے کہ ہمیشہ ایک "قالبی زبان" ہوتی ہے۔ [۱۱]

نفسیاتی ماہرین اس سے دل چسپی لیتے ہیں کہ دماغ میں زبان کس طرح ذخیرہ ہوتی ہیں؟ اور اس کی بہتر تقسیم کس طرح ہو سکتی ہے؟ اور نفسیاتی لسانی تحقیق کی ایک خاطر خواہ روایت میں ذو لسانی گروہ شامل ہے۔ چوں کہ تحولِ زبان بنیادی طور پر ایک خود ساختہ اور غیر رسمی مظہر ہے، تاہم اس کی قدرتی طور پر پائی جانے والی حالت میں اس کا مطالعہ بڑی حد تک معیاری نفسیاتی طریقہ کار کے طریقوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ [۱۲]

زبان کے مطالعے میں سائنسی مطالعہ اہم ہے۔ نفسیاتی لسانیات اور عصبی لسانیات دماغ کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہیں نیز مختلف عوارض کے موثر علاج کے لیے صلاحیت کو بڑھاتے ہیں۔ نفسیاتی لسانیات سے متعلق کچھ اہم مسائل بھی ہیں جن میں سب سے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ماہرینِ نفسیاتی لسانیات بہت کم یہ سوال اٹھاتے نظر آتے ہیں کہ آیا ذو لسانی مضامین کے مطالعے میں تمام زبانوں کو منفرد شناخت (discrete entities) کے طور

پر لینا چاہیے؟ اور اگر لینا چاہیے تو کیوں؟[۶۳] یعنی ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام ماہرینِ لسانیات ان سوالات کو اہم گردانیں کہ آیا ذولسانیت کے حامل ادب پارے میں سے ہر زبان کی منفرد شناخت کو دیکھا اور پرکھا جائے یا صرف ادب پر توجہ مرکوز کی جائے۔

نفسیاتی لسانیات پتا لگاتی ہے کہ کسی مکالمے میں کی جانے والی بات کس معنی میں کہی جاتی ہے اور دوسرا سننے والا اس سے کیا معنی اخذ کر رہا ہے۔ بعض اوقات مادری زبان کچھ اور ہوتی ہے لیکن ساتھ دوسری زبانیں بھی سیکھ لی جاتی ہیں۔ ایسے متکلم بعض اوقات دونوں زبانیں استعمال کرتے ہوئے ان کے قواعد کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ صرف ایک ماہر شخص ہی روانی کے ساتھ دونوں زبانوں کا ایک ساتھ استعمال کر سکتا ہے۔ پہلی زبان سے دوسری میں تحولِ زبان کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کے لیے زبان کے قواعد، اصول اور چند دوسرے عناصر کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے متکلم میں اتنی صلاحیت ہونا ضروری ہے کہ دوسری زبان کو جاری رکھا جا سکے۔[۶۴]

ماہرینِ نفسیاتی لسانیات زبان کے تفاعل کو یوں تقسیم کرتے ہیں[۶۵]:

۱۔ دماغ میں لسانی عناصر کا ذخیرہ اور نمائندگی

۲۔ اعصابی فعالیت اور ایک مقام inhibition اس بات کا تعین کرتا ہے کہ یہ عناصر سطح پر کیسے آتے ہیں۔

۳۔ پیداواری نظام (production mechanism)

سماجی لسانیات کی طرح نفسیاتی لسانیاتی مطالعے کے ایک بڑے حصے کی بنیاد یک لسانیت ہے۔ ذولسانی مطالعہ زبان کو پیدا کرنے اور محفوظ کرنے جیسے مسائل کی نشان دہی کرتا ہے اس کی ایک مثال ذولسانی فتورِ نطق[۶۶] (Aphasia) کا مطالعہ ہے جس کا آگے ذکر کیا گیا ہے۔ ماہرینِ نفسیاتی لسانیات پہلے زبان اور دماغ کے بارے میں ایسے معاملات سے خاطر خواہ معلومات حاصل کرتے ہیں جہاں یک لسانی زبان آسانی سے کام نہیں کرتی۔ ذولسانی پیداوار میں شامل منتقلی اور روانی اسی طرح ان عمل کے پہلوؤں کو ظاہر کر سکتی ہے جو بہ صورت دیگر پوشیدہ رہیں گے۔ لسانیات میں اقلیتی یک لسانی کے بجائے اکثریتی ذولسانی کو مطالعہ کرنا چاہیے۔[۶۷]

اگر ذولسانی دماغ میں پائی جانے والی زبانیں الگ ہوں تو نہ وہ ترجمہ کی جا سکتی ہیں اور نہ تحولِ زبان واقع ہو سکتا ہے۔ اگر وہ مکمل طور پر مربوط ہوں تو دو زبانوں میں ممکنہ طور پر ہر وقت بے ترتیب تحولِ زبان ہو تو متکلم یک لسانی طور پر گفت گو نہ کر سکیں گے۔[۶۸]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذولسانی دماغ میں ایک لغوی ذخیرہ ہوتا ہے یا دو؟ زیادہ تر تحقیقات کے مطابق ذولسانیت مکمل طور پر کسی ایک زبان میں منتقل نہیں ہوتی۔ ذولسانی دماغ کسی ایک زبان کو مکمل طور پر نہیں روک

سکتے۔[69] جیسے کہ ناول میں کم و بیش تمام ہی کردار دو زبانوں کو جانتے ہیں اور یہ صورت ان کے مکالموں میں بھی نظر آتی ہے۔ ذیل میں چند کرداروں کی مثالیں دی گئی ہیں:

"۔۔۔ میں ایک پروفیشنل ورکنگ وومن ہوں۔ تمھیں ذرا براڈ مائنڈڈ ہونا چاہیے۔"[70]

"یعنی ایک سطح پرفیکٹ اور فکشن دونوں میں کچھ زیادہ فرق ہے نہیں۔"[71]

"جاوید، مائی ڈریم آف لائف ہیز کم ٹرو۔ جاوید، میں تمھیں بتا نہیں سکتی میں کتنی خوش ہوں۔"[72]

درج بالا امثال میں روانی سے دو زبانیں بولنے والے متکلموں کی گفت گو سے چند ٹکڑے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ متکلم ایک زبان سے دوسری زبان میں تحول کرتے ہوئے بے اختیار ہوتے ہیں، انھیں خود بھی اس تحول کا اندازہ ہیں ہوتا۔

ایک نظریہ ٹیگ زبان (language tag) ہے، جو اکثر نمونوں میں پایا جاتا ہے یہ زبانوں کی دوہری قابلیت کی وضاحت کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے منسلک خصوصیات میں دماغ میں موجود الفاظ وہ زبان تصور کیے جاتے ہیں جس سے متکلم تعلق رکھتے ہوں۔ اس طرح کے مطالعے میں لغوی سطح قابلِ فخر ہے جیسے:

مفرد الفاظ کیسے محفوظ ہوتے ہیں؟

دوسرا یہ معنی کے ساتھ کس طرح جڑتے ہیں؟

کلام کے اندر جس قواعدی ساخت میں یہ ظاہر ہوتے ہیں ان کا املا کیسے کیا جاتا ہے؟ اس سطح کو فوقیت حاصل ہے اور یہ لغوی مفروضے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ زبان کی اقسام دماغ میں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں جو قابلِ رسائی ہوتی ہیں۔ یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ کون سے الفاظ کون سی زبان میں کم یا قابلِ پیمائش وقت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ نفسیاتی لسانیات کے ماہرین تعین کرتے ہیں کہ پیداواری عمل میں کس مقام پر خفیہ نویسی (Encoding) کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ کب تحولِ زبان کا فیصلہ متعلقہ ہوتا ہے۔ فعالیت سے متعلق دستیاب شواہد سے پتا چلتا ہے کہ تمام متعلقہ لغوی نمائندگی انتخاب کے عمل میں دیر سے فعال ہوتی ہے۔ میوٹر (Meuter) کا کہنا ہے کہ زبان کے انتخاب سے متعلق عوامل کی چار اہم اقسام ہیں جو ذیل میں دی گئی ہیں:[73]

۱۔ <u>غیر متعلقہ زبان کا عالمی غیر انتخاب</u> اس میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غیر انتخابی عالمی ہے یا صرف متعلقہ حصوں کو متاثر کرتی ہے۔

۲۔ مہارت کے اثرات کارکردگی کئی تجربات سے پتا چلتی ہے کہ ثانوی زبان کے مقابلے میں پہلی زبان کو روکنا مشکل ہے۔ لیکن پہلی زبان میں منتقلی میں زیادہ وقت درکار ہوتا ہے بجائے اس کے کہ ثانوی زبان میں ہی گفت گو کو جاری رکھا جائے۔ متکلم کے لیے اپنی بنیادی یعنی مادری زبان کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ جیسے:

"صاحب جی، بوا کھلا ہوا ہے۔"[۷۴]

درج بالا جملہ عالم کی گفت گو کی نمائندگی کر رہا ہے جس کی مادری زبان پنجابی ہے۔

۳۔ وہ عوامل جو منتقلی کو متحرک کرتے ہیں۔ باب کا اوپر تمام حصہ عوامل کے مباحث پر ہی مشتمل ہے۔

۴۔ نگرانی کی صلاحیت جو منتخب زبان کو برقرار رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اس کے تحت متکلم خود یا مخاطب متکلم کی گفت گو کی جانچ کرتے ہیں کہ آیا اس کی گفت گو ایک ہی زبان میں ہے یا وہ دوسری زبانوں کو بھی ساتھ ملا رہا ہے۔

یہ عوامل یقینی طور پر لاشعور کا حصہ ہوتے ہیں جیسے بعض اوقات متکلم اپنے تحول سے خود بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ میوٹر کا کہنا ہے کہ اگر ان کی گفت گو کو ریکارڈ کر کے ان کے سامنے چلایا جائے تو وہ خود بھی حیران ہوں گے۔ کیوں کہ یہ ان کی روزمرہ گفت گو کا حصہ بن گیا ہے کہ وہ دو یا زائد زبانوں کا ایک ساتھ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

زبان کے پیداواری عمل کو ہم براہِ راست مشاہدہ نہیں کر سکتے اس کے لیے مختلف نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ ذولسانی فتورِ نطق اور دماغ میں زبان کے مقام کے مطالعے سے حاصل شواہد تحولِ زبان کے نفسیاتی لسانیات کے بنیادی میدان ہیں۔[۷۵]

دماغ کے عوارض کا مطالعہ روایتی طور پر دماغ میں زبان کی نمائندگی کے بارے میں معلومات کے ذرائع کے طور پر استعمال ہوتا رہتا ہے۔ ذولسانی زبانوں کے مختلف جذباتی کردار ذولسانی فتورِ نطق (ایسی بیماری جو زبان پیدا کرنے یا سمجھنے کی نااہلی ہے، یہ دماغی خرابی کے نتیجے میں ہوتی ہے) کے کچھ مطالعے میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ذولسانی گروہ جو دماغی فتورِ نطق سے گزرتے ہیں، زبان کی صلاحیت کھو دیتے ہیں، یہ مطالعہ صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔ محققین پُر امید ہیں کہ وہ زبان کے طبعی مقام اور اس جگہ جہاں متعدد زبانوں کے استعمال یا علم کی ضرورت ہوتی ہے ان کے عملی تعامل کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں گے۔[۷۶]

گروسجین (Francois Grosjean: 1946) کا کہنا ہے کہ اس طرح کے مضامین سے نتائج اخذ کرنے سے پہلے، ان کی بیس لائن یعنی بنیادی زبان کے بارے میں کچھ اندازہ لگانا ضروری ہے، ورنہ مثال کے طور پر کوئی یہ

فرض کر سکتا ہے کہ وہ نقص شناسی[۷۷](Pathology) کے نتیجے میں تحولِ زبان کر رہے تھے، جب کہ در حقیقت یہ ان کی تقریر کا معمول تھا۔

گروسجین نے ذولسانیت کی حامل گفت گو کی جانچ میں مخصوص طریقہ کار کی نشان دہی کی ہے جیسے کہ یک لسانی افعال میں ذولسانوں کی کارکردگی کی جانچ کے وقت یک لسانی محقق کام کرے گا تو ہی وہ ذولسانی متکلم کی ذو لسانیت سے بھرپور گفت گو کو سامنے لائے گا۔[۷۸]

ذولسانی افیسیا کے لیے ضروری نہیں کہ اپنی زبانیں نقص شناسی انداز میں ملائیں بلکہ لوگوں میں بے ترتیب تحولِ زبان کا استعمال روزمرہ کا طریقہ کار ہے۔ ایک ہی طرح کے خلل جو لسانی صلاحیتوں کو متاثر کر سکتے ہیں عام طور پر تحولِ زبان کو متاثر کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ زبان کی فیکلٹی میں کسی بھی خرابی کا نتیجہ تحولِ زبان کی صورت میں ہوتا ہے۔ فتورِ نطق کے مریضوں میں تحولِ زبان غیر افیسیا ذولسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ تحولِ زبان بات چیت کا ایک عام انداز ہے۔ ماہرینِ نفسیاتی لسانیات ذولسانی نمونوں کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں، جو اکثر خاکے کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ان میں اہم عوامل کو خطوط کے ذریعے ایک دوسرے سے جوڑا جاتا ہے۔ تاکہ ان کے درمیان عارضی، وقتی اور مضمر تعلقات کو ظاہر کیا جائے۔ پیش کش کا یہ طریقہ لسانیات کے دیگر شعبوں میں کم عام ہے۔ ذولسانی کارکردگی کی وضاحت کے لیے اس طرح کے متعدد ماڈل تیار کیے گئے ہیں۔ یہ ماڈل تحولِ زبان کے بجائے ذولسانی پیداوار پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔[۷۹]

نفسیاتی لسانیاتی مطالعے میں یہ سوالات بھی بڑھتے جا رہے ہیں کہ جذباتی عوامل اس بات پر کافی اثرانداز ہوتے ہیں کہ کوئی زبان کیسے سیکھتا یا یاد رکھتا ہے نیز کس طرح اس کا استعمال کرتا ہے؟ متکلم کی پہلی زبان جو اس کی مادری زبان بھی ہو سکتی ہے ذاتی شمولیت کا زیادہ اظہار کرتی ہے۔ ثانوی زبان سے پہلے زبان کی طرف منتقلی متکلم کو زیادہ جذباتی ہونے اور ان احساسات کو پہچاننے کی طرف لے جاتا ہے جو بہ صورت دیگر واضح نہیں تھے۔[۸۰]

مادری زبانوں میں تحول کرنے یا اس سے تبدیل ہونے کے اثرات جزوی طور پر زبانوں کے درمیان عملی اختلافات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذولسانی گروہوں کے مختلف جذباتی کردار ذولسانی فتورِ نطق میں جھلکتے ہیں۔[۸۱]

دماغ میں زبان کے مقام کی ایک بڑی تاریخ ہے۔ اس بارے میں ایک اہم پیش رفت ہوتی ہے جو بروکا(Paul Broca: 1824-1880) کے کام سے سامنے آئی۔ اس کا کہنا ہے کہ دماغ میں بایاں نصف کرّے کا سامنے والا تیسرا حصہ زبان کی پیدائش کا اہم مرکز ہے۔ ویرک (Joshua D Weirick: 1983) نے الفاظ کے ہلتے جلتے عکس اور آوازوں کے لیے مختلف ساختی راستے اور یادداشت کے حصے کی نشان دہی کی۔ تب سے اب تک کئی

انواع کی تحقیقات نے ثابت کیا کہ دماغ کے بائیں نصف حصے میں زبان سے متعلق امور شامل ہیں خواہ وہ دائیں حصے کو زیادہ استعمال کرنے والے افراد ہوں یا بائیں۔ چناں چہ زبان کا بڑا تناسب بائیں نصف حصے میں موجود ہے۔[82]

مختلف زبانیں دماغ کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں یہ جاننا مشکل ہے۔ ذولسانی گروہوں کے لیے ثانوی زبان بولتے ہوئے اپنی بنیادی زبان کو روکنا مشکل امر ہے۔ اس کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے جب کہ ثانوی زبان سے واپس بنیادی زبان میں آنا نسبتاً آسان ہے۔ عام زندگی میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں اور یہ ایک قابلِ فہم بات ہے کہ متکلم اپنی بنیادی زبان سے زیادہ واقف ہوتا ہے اور اس کا زیادہ تر حصہ چوں کہ یہی زبان بولتے گزارتے ہیں لہٰذا ان کا بنیادی زبان میں واپس پلٹنا نسبتاً آسان ہے۔ اس ذولسانی دماغ میں اگر زبانیں الگ الگ ہوتیں تو نہ ترجمہ ہو سکتیں اور نہ زبانوں کی منتقلی ممکن ہوتی۔ اگر یہ مکمل طور پر مربوط ہو تو ہر وقت تصادمی طور پر زبانوں کی منتقلی ہوتی رہتی اور ایک ہی زبان میں بات کرنا ممکن نہ ہوتا۔[83]

سماجی لسانیات کی طرح نفسیاتی لسانی مطالعے کی اکثریت یک لسانیت پر بنیاد رکھتی ہے تاہم ذولسانی مطالعہ زبانوں کے ذخیرے اور پیدائش کے کچھ خاص امور سامنے لاتا ہے۔

بلوغت کے بعد زبان سیکھی جائے تو اس کا دماغ کے دائیں نصف کرّے میں ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے جب کہ مجموعی طور پر زبان دماغ کے بائیں نصف کرّے میں افعال کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ بچے جنھیں دماغ کی کوئی بیماری لاحق ہو جائے ان میں زبان کا مرکز دماغ کے بائیں سے دائیں حصے میں منتقل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح افراد میں فالج یا کوئی چوٹ لگ جانا، خون کی گردش کم ہونے یا شریانوں کے پھٹ جانے سے بایاں آدھا حصہ متاثر ہو تو اس صورت میں ممکن ہے کہ مریض کوئی نئی زبان سیکھیں جو ان کے لیے بالکل نئی ہو اور مادری زبان سے بالکل الگ ہو۔ تھکاوٹ، بے چینی اور ذہنی دباؤ میں بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی لاشعوری طور پر اختیار کر لی جاتی ہے۔[84]

نفسیاتی طور پر مشروط تحولِ زبان اور غیر وظیفوی تحولِ زبان غیر ارادی طور پر ہوتے ہیں۔ یہ صرف ذولسانی گروہوں کی گفت گو میں واقع ہوتا ہے۔ اسے ٹریگر الفاظ (trigger words) کے ذریعے فروغ دیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کی تعریف دو زبانوں کے سنگم پر موجود الفاظ کے طور پر کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں یہ متکلم کے اپنے لسانی اثر کو کھونے اور دوسری زبان میں گفت گو جاری رکھنے کا سبب بن سکتا ہے۔ کلائن کے مطابق اس طرح کے لغویے (lexemes) تحولِ زبان کا موجب ہیں نہ کہ نتیجہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹریگر الفاظ بذاتِ خود تحولِ

زبان نہیں ہوتے کیوں کہ تعامل کی زبان کا حصہ ہیں۔ یہ وہ لغویے ہیں جو دونوں زبانیں استعمال کرتے ہیں۔ ذیل میں ٹریگر الفاظ کی کچھ درجہ بندی دی گئی ہے۔

۱۔ اسم معرفہ (نام وغیرہ)

مثال کے طور پر:

ناول میں استعمال ہونے والے کرداروں کے نام، شہروں (کراچی، جہلم، منڈی بہاء الدین) کے نام وغیرہ

۲۔ لغوی تبادلہ

ناول میں اس کی کئی امثال ہیں جیسے کہ ریالٹی، significance, conjecturesr، ریپری زنٹیشن، سمپل وغیرہ اور اس طرح استعمال ہونے والے متعدد انگریزی جملے نیز عربی الفاظ اور جملے لغوی تبادلے کی امثال ہیں۔

۳۔ جملے میں دوسری زبانوں کے مستعار لیے گئے الفاظ

جی ڈی پی گروتھ، مراجعت، بریسلٹ، سٹامپ پیپر وغیرہ

تحولِ زبان غیر ارادی طور پر واقع ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ متکلم کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ متکلم اگر ٹریگر الفاظ پر توجہ دے تو آسانی سے پہلی زبان میں دوبارہ گفت گو جاری رکھ سکتا ہے۔

نظریہ تخلیقِ نطق (Speech production theory) نے ترتیبِ نگرانی کے لیے دو اقسام بتائی ہیں:

پس تلفظی ترتیب: (Pre articulatory editing)

متکلم کچھ بھی بولنے سے پہلے اپنے اندر کی آواز کو سنے اس طرح وہ غلطیاں کنٹرول کر سکتا ہے۔

پیش تلفظی ترتیب: (Post articulatory editing)

متکلم بولنے کے بعد اپنی بولی گئی بات پر توجہ دے اور اپنے تاثرات کو درست کرے۔[۸۵]

ذولسانی افراد میں دو زبانیں فعال ہوتی ہیں۔ ذولسانی متکلم اپنے ذولسانی مخاطب کے ساتھ گفت گو کے لیے بنیادی زبان کا انتخاب کرتے ہیں جس میں وہ گفت گو کریں لیکن وہ اپنی مرضی سے بھی دوسری زبان میں تحول کر سکتے ہیں۔ ناول ایسی اقسام سے بھرا پڑا ہے۔ ناول کے تمام ہی کردار کم و بیش دو زبانوں پر مہارت رکھتے ہیں اور قریباً ہمیں تمام ہی ناول میں دو فعال زبانیں اردو اور انگریزی نظر آتی ہیں۔ مشعال، جاوید کے مکالموں میں متواتر تحول کی صورتیں نظر آتی ہیں۔

متکلم یک لسانی گروہوں کے ساتھ گفت گو کرتے ہوئے اپنی زبان کا کوئی لفظ استعمال کر لیتا ہے لیکن پھر احساس ہوتے ہی گفت گو کا باقی حصہ اس طرح ادا کرتا ہے کہ لفظ کی وضاحت ہو جائے۔ جیسے درج ذیل مثال میں آفتاب عالم گیر سے مخاطب ہے:

"دیکھیں، برا نہ منائیے گا۔ میں اپنے ابو کا جانتا ہوں۔ وہ بہت **رومانٹک**، میرا مطلب ہے کہ **عورتوں میں دل چسپی لیتے** تھے۔"[۸۶]

عالم گیر کی انگریزی زبان سے ناواقفیت کا احساس ہوتے ہوئے آفتاب اقبال سمجھانے کے لیے فوراً "رومانٹک" کا ترجمہ اردو میں "دل چسپی" کر دیتے ہیں۔

درج بالا تمام تر بحث کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ تحولِ زبان کے قواعدی اور نفسیاتی پہلو نہ صرف ناول میں زبان کے مطالعے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ متکلمین کی گفت گو کے ذریعے زبان کے تحول کے مختلف مظاہر کے ساتھ متکلمین کی نفسیات کو بھی سامنے کرتے ہیں اور اسی حوالے سے قاری کے سوالات کے جوابات فراہم کرتے ہیں۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)،*Code Switching*، (نیویارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس،۲۰۱۹ء)، ص۹۱۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا(کراچی: مکتبہ دانیال،۲۰۲۰ء)، ص۹۵۔

۴۔ ایضاً، ص۱۰۸۔

۵۔ ایضاً، ص۱۳۲۔

۶۔ ایضاً، ص۲۳۵۔

۷۔ ایضاً، ص۲۱۵۔

۸۔ ایضاً، ص۸۷۔

۹۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، ص۹۳،۹۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص۲۷۶۔

۱۱۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)،*Code Switching*، ص۹۲۔

۱۲۔ Prescriptive کے لیے اردو میں "تقعیدی" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ قواعد کو ایسے مجموعۂ قوانین کے طور پر پیش کرنا جو معیاری زبان استعمال کرنے کے لیے ضروری ہوں۔
عامر علی خان، فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان،۲۰۱۰ء) ص۳۸۱۔

۱۳۔ Functional کے لیے اردو لسانیات میں مستعمل اصطلاح وظیفوی ہے، قواعد کی اصطلاح میں وہ کردار جو کوئی لفظ یا اختتامیہ جملے میں ادا کرے۔
الٰہی بخش اختر اعوان،کشاف اصطلاحات لسانیات(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۵ء)، ص۲۱۵۔

۱۴۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)،*Code Switching*، ص۹۲۔۹۳۔

۱۵۔ strings کے لیے عامر علی خان "زنجیرہ" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

عامر علی خان، فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات، ص ۲۲۲۔

۱۶۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۲۲۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۱۶۔

۱۸۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۹۴۔۹۵۔

۱۹۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۹۶۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۹۷۔

۲۱۔ ایضاً ص ۲۵۷۔

۲۲۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۹۶۔۹۷۔

۲۳۔ Clitics کے لیے الٰہی بخش اختر اعوان: محدود" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔
الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، ص ۱۱۲۔

۲۴۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۹۷۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۱۳۔

۲۶۔ الٰہی بخش اختر اعوان "Open" کے لیے "کھلاوا" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔
الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، ص ۳۵۱۔

۲۷۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۹۸۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۹۹۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۶۶۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۲۶۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۹۷۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۱۲۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۸۵۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۱۶۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۱۷۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۶۲۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۹۸۔

۴۶۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۵۵۔

۴۷۔ صرفِ نحویاتی کی اصطلاح Morphosyntactic کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس میں صرفی اور نحوی دونوں خصوصیات شامل ہوتی ہیں۔ مارفیم میں اکثر جملے کی سطح کے افعال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مارفیم اس بات کی نشان دہی کر سکتا ہے کہ آیا ایک شکل جملے میں فاعل یا مفعول کے طور پر استعمال ہوتی ہے یا کسی اور طور پر۔

۴۸۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۱۰۴۔۱۰۵۔

۴۹۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۳۴۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۴۲۔

۵۱۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۱۰۴۔۱۰۵۔

۵۲۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۳۹۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۵۵۔ ایضاً،ص ۱۲۷۔

۵۶۔ Congruent کے لیے متطابق کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔وہ پیکر جو باہم مطابقت رکھتی ہوں۔
الہٰی بخش اختر اعوان،کشاف اصطلاحات لسانیات،ص ۱۳۰۔

۵۷۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا،ص ۲۲۶۔

۵۸۔ ایضاً،ص ۲۳۸۔

۵۹۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۱۰۵۔۱۰۶۔

۶۰۔ ایضاً،ص ۱۲۵۔

۶۱۔ ایضاً،ص ۱۱۷۔

۶۲۔ ایضاً۔

۶۳۔ ایضاً،ص ۱۱۸۔

۶۴۔ ایضاً۔

۶۵۔ ایضاً،ص ۱۲۰۔

۶۶۔ Aphasia کے لیے اردو میں "فتورِ نطق" کی اصطلاح مستعمل ہے۔یہ عمل نطق کا نقص ہے جو دماغی رابطے یا دوسرے اعصابی مراکز کے مجروح ہونے کا سبب ہے۔
الہٰی بخش اختر اعوان،کشاف اصطلاحات لسانیات،ص ۵۱۔

۶۷۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۱۲۰۔

۶۸۔ ایضاً۔

۶۹۔ ایضاً،ص ۱۲۰۔

۷۰۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا،ص ۸۱۔

۷۱۔ ایضاً،ص ۱۰۰۔

۷۲۔ ایضاً،ص ۸۰۔

۷۳۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۱۲۲۔

۷۴۔ سید کاشف رضا،چار درویش اور ایک کچھوا،ص ۲۴۱۔

۷۵۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز،(Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۱۲۱۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۷۷۔ بیماریوں کے اثرات و وجوہات کی سائنس۔

۷۸۔ پینی لوپ گارڈنر کلوروز، (Penelope Gardner Chloros)، *Code Switching*، ص ۱۲۲۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۸۱۔ ایضاً۔

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۸۳۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

۸۵۔ www.lingeref.com/isb/4/151ISB4.PDF.Trigger، تاریخ ملاحظہ ۵ مارچ ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۲:۰۰ بجے۔

۸۶۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۲۸۹۔

ماحصل

ماحصل

سماجی لسانیات، لسانیات کے میدان میں تیزی سے مقبول ہونے والا مضمون ہے۔ سماجی لسانیات میں زبان کا مطالعہ سماجی سیاق میں کیا جاتا ہے۔ سماجی لسانیات کے مباحث میں بولیاں ،زبانیں، لہجے، جنس، مستعاریت، تحولِ زبان، ادغامِ زبان وغیرہ شامل ہیں۔ زیرِ قلم تحقیقی مقالے کا موضوع تحولِ زبان ہے۔ سماجی لسانیات میں جب زبان میں ردوبدل وجود میں آتا ہے تو تحولِ زبان واقع ہوتا ہے۔ تحولِ زبان ذولسانی اور کثیر لسانی افراد کے ہاں ملتا ہے جو دو یا زائد زبانوں میں روانی رکھتے ہیں۔ ایسے افراد کو اختیار حاصل ہے کہ وہ دورانِ گفتگو کب کس زبان کا استعمال کریں۔ عام الفاظ میں ہم اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ جب متکلم کسی گفتگو کے دوران ایک سے زائد زبانوں کا استعمال کرے تو یہ کیفیت تحولِ زبان کہلاتی ہے۔

راقمہ نے اسی کیفیت کا مقالے میں جائزہ لینے کے لیے سید کاشف رضا کے ناول چار درویش اور ایک کچھوا کا انتخاب کیا ہے۔ ناول پر تحولِ زبان سے متعلقہ پینی لوپ گارڈنر کلوروز کے نظریات کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل سوالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے جوابات تلاشنے کی کوشش کی گئی ہے:

۱۔ چار درویش اور ایک کچھوا میں تحولِ زبان کے اشکال و مظاہر کیا ہیں؟

۲۔ ناول میں ایک سے دوسری زبان میں منتقلی کی کیا وجوہات ہیں؟

۳۔ قواعدی اور نفسیاتی لسانی اعتبار سے تحولِ زبان کے کون سے پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟

۴۔ ناول کی معنویت پر اس کا کیا اثر پڑا؟

اس سے درج ذیل نتائج سامنے آئے:

کسی تقریری یا تحریری گفتگو کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحولِ زبان جملے میں کئی صورتوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات جملے کے آغاز، وسط یا اختتام پر ظاہر ہو سکتا ہے۔ تحولِ زبان کے مطالعے سے ناول میں یہ پرکھا گیا ہے کہ تحولِ زبان کہاں کہاں واقع ہوا ہے؟ کس حد تک مختلف زبانوں کو آپس میں ملانے کی کوشش کی گئی ہے؟ تحولِ زبان مہاجر معاشروں میں زیادہ استعمال ہوتا ہے اس کیفیت کو ناول میں بھی مشاہدہ کیا گیا ہے۔ تحولِ زبان پڑھے لکھے اور ان پڑھ افراد کی گفتگو میں جانچا جا سکتا ہے۔ تحولِ زبان کا انحصار متکلم کی عمر اور تحولِ زبان کی قسم پر بھی ہوتا ہے۔

تحولِ زبان کے تحت بعض اوقات اصطلاحات اور بعض اوقات پورے جملے ساخت سمیت دوسری زبان میں مستعار لیے جاتے ہیں۔ کئی زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کے متبادل گو کہ اس زبان میں موجود بھی ہوتے ہیں

پھر بھی دوسری زبان کے الفاظ رائج ہو کر اس کا حصہ بن جاتے ہیں، جیسے مغربی زبانوں کے کئی الفاظ اردو میں رائج ہو کر اس کا حصہ بن گئے ہیں۔ باب سوم میں امثال کے ساتھ اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

تحولِ زبان کی وجوہات پر مقالے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بعض اوقات متکلم کے تحولِ زبان کا انحصار دوسرے متکلم کے تحولِ زبان پر ہوتا ہے کہ اس نے پہلے اس کا استعمال کیا ہوتا ہے۔ تحولِ زبان کا استعمال سماجی میدانوں میں گفتگو کی بحالی کے لیے، غم و غصہ، طنز و مزاح وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ تعلقات کو مستحکم کرنے کے لیے اور بعض اوقات بات کو بہتر طور پر سمجھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ متکلم جب کسی بات کے لیے کسی دوسری زبان کو زیادہ مناسب گردانتا ہے تو اس میں گفتگو کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس یک لسانی گروہ کے حامل افراد چہرے کے تاثرات اور لہجے کے اتار چڑھاؤ کا سہارا لیتے ہیں۔ ناول میں بھی زبان کی منتقلی کی درج بالا تمام وجوہات کا اطلاق کیا گیا ہے۔

تحولِ زبان کے سماجی عناصر کا ایک سلسلہ ہے جو تحولِ زبان کی صورت طے کرتے ہیں۔ وہ عناصر بھی اس میں شامل ہیں جو مخصوص متکلم اور مخصوص حالات پر منحصر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ متکلم سے متعلق عناصر میں اجتماعی یا انفرادی طور پر متکلم کے تعلقات، رویے، نظریات اور تاثرات شامل ہوتے ہیں۔

مقالہ ہٰذا میں تحولِ زبان کے نفسیاتی لسانی اور قواعدی پہلوؤں کا تفصیلی بیان پینی لوپ گارڈنر کلوروز کے نظریات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ مقالے میں ان نظریات کا اطلاق ناول پر ملتا ہے جو ناول کی معنویت کو بڑھانے میں نمایاں رہے ہیں۔ تحولِ زبان کے قواعدی پہلوؤں میں اسما اور قواعدی زمروں کی منتقلی اور جملوں کی ساخت کو مع امثال زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اسی طرح نفسیاتی لسانیات یہ پتا لگاتی ہے کہ کسی کہنے والے نے بات کس سیاق میں کی ہے اور سننے والے نے اسے کن معنوں میں لیا ہے؟ باب چہارم میں زبان کے دماغ میں مقام اور زبان کے سیکھنے کے عمل پر بحث کی گئی ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ دماغ کے بائیں نصف کرے کا سامنے والا حصہ زبان کی پیدائش کا مرکز ہے۔ مختلف زبانیں دماغ میں مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں۔ بچوں اور بڑوں کے دماغ میں زبان کے وجود اور دماغی عوارض کا بیان بھی اسی باب میں کیا گیا ہے۔

تحولِ زبان کے ساتھ ایک اصطلاح ادغامِ زبان بھی استعمال ہوتی ہے۔ کئی ماہرین ان کو ایک ہی گردانتے ہیں لیکن کئی ماہرین نے ان میں فرق یوں واضح کیا ہے کہ جب متکلم کسی گفتگو کے دوران مکمل طور پر دوسری زبان میں تحول کرے تو یہ کیفیت تحولِ زبان کہلاتی ہے اور جب متکلم گفتگو کے دوران دوسری زبانوں کے الفاظ کو وقتاً فوقتاً شامل کرتا رہے تو یہ کیفیت ادغامِ زبان کہلاتی ہے۔

جہاں تحولِ زبان کے کئی فائدے ہیں وہیں اس کے کئی نقصانات بھی ہیں جیسا کہ تحولِ زبان ہی کی وجہ سے کئی زبانیں آپس میں مدغم ہو کر دوسری زبان کی ناپیدی کا سبب بنتی ہیں۔

تحولِ زبان کے تحت ذولسانی یا کثیر لسانی گروہ دوسری زبانوں کی خصوصیات کو متاثر کیے بغیر متبادل کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ زبانوں کے مطالعے میں بعض اوقات اسے اہم موضوع کے طور پر زیرِ بحث لایا جاتا ہے جب کہ اکثر اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لسانیات کے شعبے میں تحولِ زبان کے مطالعے کی ترویج کے لیے مناسب حکمت عملی کی جائے اور نصاب میں اس موضوع کو بہ طور اہم موضوع شامل کیا جائے۔

راقمہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں سید کاشف رضا کے ناول چار درویش اور ایک کچھوا کا تحولِ زبان کے حوالے سے سماجی لسانیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ناول کا ایک اہم کردار "ارشمیدس" ہے جو ایک کچھوا ہے۔ ناول میں یہ کچھوا چوں کہ ہمیں انسانوں کی طرح بولتا، سنتا اور دیکھتا دکھائی دیتا ہے لہٰذا ناول کا جادوئی حقیقت نگاری کے حوالے سے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول کو اس کی جدید تکنیک کے تناظر میں بھی جانچا سکتا ہے۔

کتابیات

کتابیات

بگھیو، محمد قاسم۔لسانیات تا سماجی لسانیات، مترجم خوشی محمد جاوید۔لاہور: فکشن ہاؤس پبلشرز، ۲۰۱۹ء۔

بوکامبا، ای جی۔ *"Are these Syntactic Constraints on Code Mixing"*

مشمولہ ورلڈ انگلشز۔شمارہ۸، بلومز بری پبلشرز، ۱۹۸۹ء۔

پاریکھ، رؤف۔لسانیات کے بنیادی مباحث۔کراچی: اردو بازار، ۲۰۱۹ء۔

ٹیز، ٹینسی۔ "Speech and Society among the IndonesianElite, A Case Study of a Multilingual Community" مشمولہ *Anthropological Linguistics*۔ ٹرسٹیز آف انڈیانا، ۱۹۶۷ء۔

ڈاؤنس، ولیم۔ *Language And Society* ۔ کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۸ء۔

سپالسکی، برنارڈ۔ *Sociolinguistics*۔ آکسفرڈ: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۸ء۔

سوزین، رومینی ۔ *Language in Society: Am Introduction to Sociolinguistics*، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء۔

فش مین، جوشوا اے۔ *The Sociology Of Language*۔ نیو یارک : نیو بری ہاؤس پبلشرز، ۱۹۷۲ء، ص ۴۶۔

کلوروز، پینی لوپ گارڈنر۔ *Code Switching*۔ نیویارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۹ء۔

گمپرز اینڈ بلوم۔ *Sociolinguistics and Communication in Small Groups*، پینگوئن بکس، ۱۹۷۲ء۔

میئر ہوف، مریم۔ *Introducing Sociolinguistics*، نیویارک: روٹلیج، ۲۰۰۶ء۔

ورڈا، رونالڈ۔ *An Introduction To Sociolinguistics*، بلیک ویل: سسیکس ۲۰۱۶ء۔

ہڈسن، آر اے۔ *Sociolinguistics*۔ کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۶ء۔

ویب سائٹس(Websites):

اعوان، فیصل اقبال۔ چار درویش اور کچھوا :بدقسمت اردو ناول کے تابوت میں ایک اور کیل

https://www.humsub.com.pk/316915/faisal-iqbal-awan-19/

تاریخ ملاحظہ ۲۱ اگست ۲۰۲۱ء، بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔

الرحمان، نعیم۔ جادوئی حقیقت نگاری پر مبنی اردو ناول :چار درویش اور ایک کچھوا

https://daanish.pk/30231، تاریخ ملاحظہ ۲۱ اگست ۲۰۲۱ء، بوقت ۱۱:۰۰ بجے۔

بھٹی، بلال حسن۔ درویشوں کی پول کھولتا کچھوا اور سید کاشف رضا

https://urdu.arynews.tv/review-by-bilal-hassan-bhatti-on-syed-kashif-raza-novel/، تاریخ ملاحظہ: ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ء بوقت ۱۱:۰۰ بجے۔

تیمور، محمد۔ چار درویش اور ایک کچھوا

https://daanish.pk/37177، تاریخ ملاحظہ: ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۱ء، بوقت ۹:۰۰ بجے۔

حسین، اظہر۔ سید کاشف رضا کا کچھوا :ایک لاتنقیدی تجزیہ

https://www.humsub.com.pk/284478/azhar-hussain-11/ .

تاریخ ملاحظہ: ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ء بوقت ۲:۰۰ بجے۔

حسینی، محمد عامر۔ چار درویش اور کچھوا :کاشف رضا تم شوکت تھانوی نکلو گے، سوچا نہ تھا،

https://jagarti.wordpress.com/2017/11/13/%da%86%d8%a7%d8%b1-%d8%af%d8%b1%d9%88%db%8c%d8%b4-%d8%a7%d9%88%d8%b1-%da%a9%da%86%da%be%d9%88%d8%a7-%da%a9%d8%a7%d8%b4%d9%81-%d8%b1%d8%b6%d8%a7-%d8%aa%d9%85-%d8%b4%d9%88%da%a9%d8%aa-%d8%aa%da%be، تاریخ ملاحظہ ۲۱ اگست ۲۰۲۱ء، بوقت ۱۲:۰۰ بجے۔

حیات، خضر۔ ممنوعات کا ناول :چار درویش اور ایک کچھوا، از سید کاشف رضا

http://www.aikrozan.com/syed-kashif-raza-first-novel، تاریخ

ملاحظہ: ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ءبوقت ۲:۰۰ بجے۔

خان، ظفراللہ۔ چار درویش اور ایک کچھوا
https://www.humsub.com.pk/237712/zafarullah-khan-168/، ،
تاریخ ملاحظہ ۲۱ اگست ۲۰۲۱ء، بوقت ۲:۰۰ بجے۔

شیر، آدم۔ حقیقت کی حقیقت؟(چار درویش اور ایک کچھوا پر تبصرہ)،
http://www.mukaalma.com/89364، تاریخ ملاحظہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ءبوقت ۵:۰۰ بجے۔

عباسی، زبیر فیصل۔چار درویش اور ایک کچھوا ...رنگ برنگی دنیا کی سیر کرواتا ناول
https://urdu.nayadaur.tv/11311/، تاریخ ملاحظہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ءبوقت ۴:۰۰ بجے۔